# اخوان المسلمون

## کا تربیتی نظام

علامہ یوسف القرضاوی

# اخوان المُسلمون

## کا تربیتی نظام

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ: عبداللہ فہد فلاحی

ادارہ مطبوعات طلبہ

۱۔اے :ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور فون 042-37428307

جملہ حقوق بحق ادارہ مطبوعات طلبہ محفوظ ہیں

کتاب: اخوان المسلمون کا ترجمتی نظام
مصنف: علامہ یوسف القرضاوی
مترجم: عبداللہ فہد فلاحی
ناشر: سید ہدایت الرحمٰن حسن

(مہتمم، ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور)
Email: idaramtpak@gmail.com
Website: www.imtbooks.com
0335-4014015
+92423-7428307

اشاعت: مارچ ۲۰۲۱ء
قیمت: ۲۰۰ روپے

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| ۱ | آغاز کلام | ۶ |
| ۲ | ربانیت | ۱۳ |
| ۳ | جامعیت | ۳۸ |
| ۴ | تعمیر و ایجابیت | ۱۰۴ |
| ۵ | اعتدال و توازن | ۱۲۲ |
| ۶ | اخوت و اجتماعیت | ۱۴۷ |
| ۷ | خاتمہ | ۱۵۷ |


ادارہ مطبوعات طلبہ

1-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 042-37428307

# عرض ناشر

"اخوان المسلمون کا تربیتی نظام" علامہ یوسف القرضاوی کی مشہور تصنیف "التربیۃ الاسلامیۃ و معالمہ حسن البنا" سے عبداللہ فہد فلاحی صاحب نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ اور اس کتاب کو پہلی بار ۱۹۸۲ میں ہندوستان پبلی کیشنز نے دہلی سے شائع کیا۔ اس کے بعد ہندوستان پبلی کیشنز کے تعاون سے ادارہ مطبوعات طلبہ نے ستمبر ۱۹۸۲ میں شائع کیا۔

جو لوگ اخوان کی بے مثال قربانیوں اور مجاہدانہ سرگرمیوں پر انگشت بدنداں ہیں انہیں اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ یہ ساری سیمابی قرآن وسنت کے عمیق مطالعہ اور خدمت دین کے گہرے جذبہ کی مرہون منت تھی اور آج جو لوگ فکر وعمل کی دور روشنی اور جذبہ وحرکت کی وہی بے تابی پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وسنت سے براہ راست استفادہ کریں اور وہی جذبہ اور تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

امید ہے کہ اردو داں طبقہ اس کتاب کا استقبال کرے گا اور کتاب کو پیش کرنے کا جو مقصد ہے اسے پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

ہم اللہ سے دست بدعا ہیں کہ اس کتاب کے مصنف، مترجم، ناشر اور جملہ معاونین کو ثواب دارین سے نوازے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس دعا پر آمین کہیں۔

سید ہدایت الرحمن حسن

ادارہ مطبوعات طلبہ

جولائی ۲۰۱۹

# کچھ اپنی زباں میں

اخوان المسلمون کی تحریک و تنظیم، مجاہدانہ اسپرٹ اور غلبہ دین کے لیے اس کی بے پناہ کوششوں سے قطع نظر بعض حلقوں میں اس کی تربیت فکر و نظر معرض بحث رہی ہے حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو شخص تربیت و اصلاح کے میدان خارزار سے نہ گزر چکا ہو، فکر و نظر کا وافر سرمایہ نہ رکھتا ہو اور خدا سے مضبوط تعلق اور ہر موڑ پر اس سے استعانت کا خوگر نہ ہو، رزمگاہ حق و باطل میں قدم رکھ سکتا ہے نہ ثابت قدمی دکھا سکتا ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی کی یہ تصنیف غالباً ایسے ہی لوگوں کے لیے مسکت جواب ہے۔ اس میں اخوان کے تربیتی نظام کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اخوان کی ساری جدوجہد اور تمام تر سرگرمیوں کا مرکز و محور محض رضائے الٰہی تھا اور انہوں نے کتاب و سنت سے ماخوذ تربیتی نظام سے بھرپور استفادہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ تعذیب کے ہر دور میں اور آزمائش کے ہر مرحلہ پر ثابت قدم رہے۔

اس کتاب کے ترجمہ کے سلسلہ میں صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر اس میں کوئی ندرت و خوبی، حرکت و عمل کا محرک اور جذبہ بیدار نظر آئے تو فاضل مصنف کا کارنامہ ہے اور اگر کوئی نقص یا خرابی محسوس ہو تو مجھے براہ راست آگاہ کیا جائے تاکہ اس کی تلافی ممکن ہو سکے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اخوان کے اندر پائے جانے والی ایمان و یقین کی گرمی حرکت و عمل کی بے تابی ہمارے اندر بھی پیدا فرما دے تاکہ خس و خاشاک باطل کو جلا کر اپنا آشیانہ تعمیر کر سکیں اور اپنی منزل آپ پیدا کر کے اقبالؒ کے بقول "زندوں" میں شمار ہو سکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

عبید اللہ فلاحی

گلشن سہیل بدباغ

علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

11/01/1982

# آغاز کلام

ذرا تصور کیجئے کسی خشک زمین کا جہاں برگ و لالہ و سنبل کا دور دور تک پتہ نہ ہو لیکن بارانِ رحمت کا چھینٹا پڑتے ہی وہ لہلہانے اٹھے۔ سنبل و ریحان کی کھیتیاں اُگ آئیں اس کے تن مردہ میں خونِ زندگی دوڑنے لگے اور اس کی فضائیں لالہ و سمن کے قہقہے گونجنے لگیں۔

چودھویں صدی کے وسط میں امت مسلمہ کا حال بنجر زمین کا سا تھا۔ خلافت کے پائے چوبیں ٹوٹ چکے تھے جو اسلامی ممالک برطانوی، فرانسیسی اور دوسرے سامراجوں کے پنجے تلے سسک رہے تھے حتیٰ کہ ہالینڈ جس کی آبادی چھ لاکھ سے زائد نہ تھی، انڈونیشیا کے ایک کروڑ باشندوں پر بے لوث سنگین حکمران تھا، اس نے اسلامی احکام کا چہرہ مسخ کر دیا تھا اور قرآن کو پس پشت ڈال کر اس کی توہین کا مرتکب ہو رہا تھا۔ خود ساختہ مغربی قوانین کی آندھی تقلید اور غیر ملکی قدریں مسلمانوں کی زندگیوں پر مسلط ہو چکی تھیں۔ نئی تہذیب کے دلدادہ اور نام نہاد تہذیب کے علمبردار نوجوان خاص طور سے اس کا شکار تھے۔ میدان تعلیم و تربیت اور ذرائع ابلاغ پر استعماری غلبہ کی وجہ سے نوجوان اور طلبہ کی کھیپ کی کھیپ، صاحب خان بہادر بن کر نکل رہی تھی۔ جن کا نام تو اسلامی تھے لیکن عقلیں مغرب کی پروردہ تھیں۔

ذہنی غلامی کی اس وبا کو مسلمانوں کے انحطاط و تنزل اور شکست خوردگی نے زیادہ وسیع الاثر بنا دیا۔ اب ذہنی غلامی کے ساتھ احساس کمتری اور مغلوبیت نے بھی مزید خرابیاں پیدا کیں۔ معاشرے میں مغربی معاشرت کی طرف لپک اور تیز ہو گئی اور مسلمانوں کا رہا سہا وقار بھی جاتا رہا۔

جب حالات اس حد کو جا پہنچے تو خدا کی مشیت جوش میں آئی اسلام کی حفاظت، قرآن کی ابدیت اور دین کے غلبہ کی اس نے ذمہ داری لے لی ہے اس لیے تجدید و احیائے دین کے لیے عروق مردہ امت میں روح پھونکنے کے لیے اسے ترقی و کامرانی کے بام عروج پر پہنچانے کے لیے اس نے حسن البنا کا انتخاب کیا، جنہوں نے تحریک اخوان المسلمون کی بنیاد ڈالی جس کے

انمٹ نقوش آج زندگی کے ہر میدان میں، جہد وعمل کے ہر گوشے میں اس صدی کے تاریخ کے ہر ہر ورق پر ثبت ہیں۔ عالم اسلام کے اندرون بھی اور مغربی ممالک کے بت خانوں میں بھی۔

مصری عربی اور اسلامی دنیا پر اخوان نے جو زبردست اثرات ڈالے ہیں اور جن عالمی تبدیلیوں کا سبب بنی ہے، یہاں اس کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں اس لیے کہ اسے ہر فرد اپنے ذرائع ووسائل اور عقل وفہم کی حد تک سمجھ سکتا ہے۔ یہ تو اس تحریک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تاریخ ترتیب دے اگرچہ بار بار تصادم اور آویزش نے تحریک کو اس کا موقع نہ دیا لیکن یہ عذر زیادہ اہمیت کے لائق نہیں ہے۔

آج میرا مقصد اخوان کے نظام تعلیم وتربیت کو اجاگر کرنا ہے جسے انہوں نے اسلام، قرآن اور احادیث سے سمجھا ہے۔ اور جس کے مطابق انہوں نے اپنی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے میرا مقصد احاطہ اور استقصاء ہرگز نہیں صرف نقوش راہ کو اجاگر کرنا اور جادۂ منزل کی نشاندہی کرنا ہے تاکہ اخوان کا نظام تعلیم وتربیت اور اس سلسلے میں ان کی قابل قدر کوششوں کا مجمل خاکہ سامنے آسکے۔

حالات پر نظر رکھنے والے کسی فرد سے یہ پوشیدہ نہیں کہ اخوان نے تربیت اسلامی کی نہایت کامیاب مثال قائم کی ہے۔ ان کے سامنے جدید مسلم نسل کی تربیت واصلاح کا مقصد تھا جو اسلام کو پورے شعور کے ساتھ سمجھ سکے اس پر دل کی آمادگی کے ساتھ ایمان رکھے اور اس کے مطابق اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرے اور اللہ کے حکم کو بلند کرنے اس کی شریعت کو نافذ کرنے اور اس کی امت کو وحدت کی لڑی میں پرونے کے لیے جہاد کرے۔

اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس تحریک نے مندرجہ ذیل امور کا سہارا لیا:

۱۔ اس بات پر غیر متزلزل ایمان کہ سوسائٹی کو بدلنے کے لیے تغیر سیرت اور حصول مقصد کے لیے تربیت ہی واحد ذریعہ ہے۔ حسن البنا شہیدؒ کی یہ تعلیم تھی کہ تربیت طویل ریاضتوں، صبر آزما مراحل اور مشکلات ومصائب کی ان گنت وادیوں کو طے کرنے

کے بعد ہی منزل کو پہنچتی ہے جس کے متحمل وہی لوگ ہو پاتے ہیں جن کے اندر عزم و حوصلہ ہوتا ہے ناقابل شکست قوت تسخیر ہوتی ہے پہاڑوں کو چیرنے اور سمندروں میں راہ بنانے کا بوتہ ہوتا ہے۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود امام شہیدؒ کو کامل یقین تھا کہ منزل تک پہنچنے اور لیلائے مقصود سے ہم کنار ہونے کا یہی واحد طریقہ ہے جس میں کوئی تبدیلی درست نہیں ہو سکتی۔ جس سے بے نیازی ممکن نہیں ہے، جسے نبیؐ نے اختیار کیا تھا اور ایسی نسل تیار کی تھی جس کی مثال فلک نے کبھی دیکھا نہ سنا اور اس طریقہ تربیت نے قوموں اور نسلوں کو حق اور انصاف کے راستے پر قائم رکھا۔

۲۔ تربیت کا معروف و متعین طریقہ، جس کے نقوش، واضح، ماخذ نمایاں، اطراف و جوانب درخشاں اور اسلوب حکمت و دانائی کے ساتھ مقنوع ہیں جس کا فلسفہ واضح تر اور تصور روشن ہے جو صرف اور صرف اسلام سے مستفاد اور ماخوذ ہے۔

۳۔ ایک ایجابی اجتماعی ماحول، جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر مسلم کی تعاون و اشتراک کے ساتھ اسلامی زندگی گزارنے میں مدد کرے، وجدانی اور عملی قوتوں میں باہمی تعاون ہو، آدمی کی فطرت ہی مدنی الطبع ہے وہ اخوان و انصار کی طاقت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ جماعت ایک طاقت ہے جو خیر و طاعت کے اپنانے اور شر و معصیت سے بچانے میں ہر فرد کی مدد کرتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔" یعنی اسے خدائی طاقت حاصل ہوتی ہے اور "بھیڑیا اس بکری کو کھاتا ہے جو اپنے ریوڑ سے دور نکل گئی ہو۔"

۴۔ ایک انقلابی قائد جس کی فطرت، تہذیب اور اس کی عملی زندگی نے خود تربیت کا کام انجام دیا جسے اللہ نے غیر معمولی حرارت ایمانی سے نوازا تھا جس نے اپنے متعلقین اور نزدیک کے لوگوں پر اچھے اثرات چھوڑے اور ان کے دلوں کو اپنے دلوں سے قریب کر دیا اس لیے کہ :

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

لیکن گفتگو اگر محض زبانی ہو اور انسان کا کردار ان اصولوں سے خالی ہو جن کی وہ تبلیغ کرتا پھر رہا ہے تو ایسی دعوت کانوں سے ٹکرا کر صدائے بازگشت بن جاتی ہے دل زندہ وہ ہے جو اپنے سامعین اور حلقہ بگوش افراد کو متاثر کر سکے، رہا دل مردہ تو وہ دوسرے دلوں کو زندہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ جو خود اپنی متاع گراں مایہ کھو چکا ہو وہ بھلا دوسرے کو کیا دے سکتا ہے۔

۵۔ خلوص و ایمان کی دولت سے مالا مال مربیوں کی ایک کھیپ، جو اپنے قائد کے طریقہ تربیت پر کامل یقین رکھتی تھی جس نے اس مقصد کے لیے جان توڑ کوششیں کیں۔ اپنے شاگردوں اور نوجوان بھائیوں کے اندر اس ایمانی آگ کو روشن کیا اور پھر ان کے تربیت یافتہ دیوانے اپنا یہ جنون گراں مایہ اپنے بعد والوں کو منتقل کرتے رہے۔

یہاں مربیوں سے میری مراد علوم تربیت و اصلاح کی کتب گاہیں اپنے دماغوں میں اتارنے والے اور اعلیٰ ڈگریوں کے حامل اساتذہ نہیں ہیں بلکہ میرا مقصود ایسے افراد ہیں جنہوں نے ایمان کی انگیٹھی اپنے دلوں میں سلگائی تھیں جو تزکیہ نفس، روحانی پاکیزگی، عزم مستحکم، وسعت قلب اور دلوں کو اپنی طرف کھینچنے والی مقناطیسی شخصیت کے حامل تھے ان میں میں اگر انجینئر، ڈاکٹر، پروفیسر بھاری تنخواہیں پانے والے سرکاری ملازمین تاجر اور وکلاء تھے تو ایسے افراد کی تعداد بھی کم نہ تھی جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک دن بھی کسی ٹریننگ سینٹر یا اصلاحی ادارہ میں نہ گزارا تھا۔

۶۔ مختلف ذرائع و وسائل..... انفرادی و اجتماعی، نظری و عملی، عقلی و جذباتی، ایجابی و سلبی..... اپنے گئے چھوٹے سے چھوٹے درسوں سے لے کر تقریروں، لیکچروں، اجلاسوں اور انفرادی گفتگوؤں تک یہ کام پھیلا ہوا تھا۔ دینی شعائر کا تحفظ، نعروں اور

جلوسوں کا اہتمام، دلوں میں اتر جانے والے اور دماغوں کے تاروں کو جھنجھوڑ دینے والے نغموں اور ترانوں کا استعمال کیا گیا، گھروں میں، نجی محفلوں میں، ثقافت و تہذیب اور عبادات و اخوت پر غیر رسمی باتیں ہوتی رہیں اور اسے "کنبہ" کا نام دیا گیا اس معنی میں کہ اس نے ایک گھر کے فرزندوں میں اخوت و محبت قائم کی۔

جماعت کے کارکنوں کے ساتھ نشستیں ہوئیں اور یہ بالعموم رات کو ہوتیں جن میں عقلوں کو تہذیب و ثقافت کی غذا ان ملتی، دل عبادتوں کی لذت سے مال مال ہوتے، بدن ریاضتوں میں مشغول ہوتے اور اسے "ہراول دستہ" کا نام دیا گیا اس معنی میں کہ اس نے جہاد کا معنی و مفہوم زندہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مسلم انسان کی تعمیر کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے انہیں اپنانے کی کوشش کی گئی۔

ہر انسان کی تربیت مقصد و نصب العین کے لحاظ سے الگ الگ طریقے سے ہوتی ہے حتی کہ جانوروں میں بھی یہ چیز دیکھنے میں آتی ہے دودھ حاصل کرنے کے لیے گائے کو جس طریقے سے پالا جاتا ہے اس کا انداز تربیت اس سے مختلف ہوتا ہے جو گوشت حاصل کرنے یا اسے کھیت میں جوتنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

اسی طرح انسان کی تربیت کا مسئلہ بھی ہے چنانچہ ایک کمیونسٹ تربیت دوسرے ڈھنگ سے کی جاتی ہے جبکہ بورژوا یا سرمایہ دار مہاجن کی بالکل اسی کے برعکس طریقے پر، تقلیدی مسلمان کی تربیت کا طریقہ کچھ اور ہوتا ہے اور ایجابی مسلمان کا کچھ اور ایک مسلم کی تربیت جس ماحول میں ہوتی ہے اس پر قرآن کی چھاپ ہوتی ہے اور اسلامی تعلیمات کی اس پر حکمرانی ہوتی ہے ایسے معاشرے میں کسی مسلم کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ جس میں اسلام اور جاہلیت میں کش مکش برپا ہو کفر و اسلام اور آزادی و پابندی میں تصادم ہو۔

وہ مسلمان جو اسلام کے بحر و ذخار سے نماز روزہ، ذکر اور دعا جیسی چند چیزوں کے حاصل کرنے پر اکتفا کرتا ہے اس کے سامنے جب اسلام اور ملت اسلامیہ کی حالت زار کا تذکرہ

ہوتا ہے تو وہ کچھ افسوس ظاہر کرتا اور کلمات ہمدردی ادا کرتا ہے ایسے مسلمانوں کی تربیت آسان ہے لیکن اگر ایسے مسلم کی تربیت مقصود ہو جس کا سینہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے آگ پر رکھی ہانڈی کی طرح ابال کھاتا ہو جس کا دل مسلمانوں کے حالت زار پر پگھل پگھل جائے اور غم اور درد و کرب اسے دفاعی اقدامات اور تبدیلی و انقلاب کے لیے بے چین کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تربیت کچھ دوسرے خطوط پر ہوگی۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہی تربیت مقصود و مطلوب ہے اور ایسے ہی مسلم نوجوانوں کی ضرورت ہے جو حالات کے رخ پر بہنے کے بجائے انہیں اللہ کے حکم کے مطابق پھیر دینے کا عزم رکھتے ہوں جو اس بات پر ایمان رکھتے ہوں کہ

عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

جس کی نگاہیں تقدیروں کو بدل دیتی ہیں جو ذرائع و وسائل کی محدودیت سے بالا ہو کر قضا و قدر کی موشگافیوں کے دلدل سے نکل کر اقامت دین کے لیے تعمیر امت کے لیے اور احیائے اسلام کے لیے کام کرتا ہے اور حقیقت میں مسلم وہی ہے جو ایسے پیغام کو لے کر اٹھے۔

"جس کی لمبائی زمانہ سے دراز تر، جس کی چوڑائی کائنات سے زیادہ اور گہرائی اتنی دور رس ہے کہ دنیا و آخرت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔" (حسن البناؒ)

اس امت کو اللہ نے بہترین کتاب قرآن سے نوازا ہے، آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو اس کے درمیان مبعوث کیا ہے، اسے سب سے بہترین امت قرار دیا ہے، اسے ہر چیز میں معتدل بنایا ہے اور دنیا کی قیادت و رہنمائی اور حق کی گواہی کے لیے اسے مامور کیا ہے۔

یہ تہذیب الہامی ہے پوری دنیا کے لیے ہے۔ اخلاقی و کردار سے مالا مال ہے ایمان و

سائنس کی جامع ہے۔ مادہ و روح اور دنیا و آخرت میں اعتدال و توازن قائم کرتی ہے اور انسانی شرافت اور بنیادی خصوصیات کا تحفظ کرتی ہے۔

اخوان المسلمون کی سب سے بڑی ذمہ داری اسی مسلم کی تربیت ہے اس کے لیے کہ انقلاب کی پہلی اینٹ یہی ہے۔ صلاح و خیر اور اصلاح اعمال کا یہ محور و مرکز ہے اس کے بغیر اسلامی معاشرہ کا قیام یا اسلامی حکومت اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اخوان نے افراد کی تربیت میں مندرجہ ذیل پہلوؤں کو خصوصی طور سے ملحوظ رکھا ہے۔

ربانیت، جامعیت، تعمیر و ایجابیت، اعتدال و توازن، اخوت و اجتماعیت، اور صبر و استقلال۔

موقع و محل کی گنجائش کے لحاظ سے آگے صفحات میں انہیں کی مختصر تشریح ہے اور توفیق اللہ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

(ڈاکٹر یوسف القرضاوی)

# فصل (۱)

## ربانیت

ایمان اقرار و عمل کا نام ہے
ایمان کی تابناکی دل زندہ پر منحصر ہے
دل مردہ دل نہیں ہے!
دلوں کو مادہ پرستی سے بچائیے!
انہیں روحانی غذا فراہم کیجئے!
ان کے علاج کی فکر کیجئے!

قہاری و غفاری و قدوسی جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
(اقبالؒ)

"تصورات اسلامی کا بنیادی وصف ربانیت ہے جو تمام دیگر اوصاف کی بنیاد ہے یہ تصو
رچونکہ من جانب اللہ ہے اور ربانی ہے اس لیے یہ انسانی زندگی کے فرائض میں سے ہے کہ وہ
تمام مظاہر حیات میں اس تصور کو سموئے، نافذ کرے اور اس سے مطابقت اختیار کرلے۔"
(سید قطب شہیدؒ)

## ایمان اقرار و عمل کا نام ہے :

ربانیت یا ایمان اسلامی تربیت کا جیسا کہ اخوان المسلمون نے سمجھا ہے، سب سے اہم عنصر ہے۔ یہ سب سے زیادہ لائق توجہ اور دور رس اثرات کا حامل ہے اس لیے کہ اسلامی تربیت و تزکیہ کا اولین مقصد ایک مومن انسان کی تعمیر ہے۔

اسلام میں ایمان محض زبانی دعوے کا نام نہیں ہے۔ کسی شخص کی زبان سے یہ اعلان کر دینا کہ وہ مومن ہے اسے مومن نہیں بنا دیتا بلکہ یہ ایک ایسی روحانی و اخلاقی حقیقت ہے کہ جو انسان دل و دماغ کی گہرائیوں تک اپنا اثر و نفوذ رکھتی ہے اس کی شعاعیں جذبات تک پہنچتی ہیں تو ان میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں اور جب عزم و ارادہ پر اس کی کرنیں پڑتی ہیں تو ان میں حرکت و عمل جاگ اٹھتا ہے جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے :

اَلْاِیْمَانُ هُوَ مَا وَقَرَ فِی الْقَلْبِ وَصَدَّقَهُ الْعَمَلُ (حدیث)

"ایمان وہ ہے جو دل میں سرایت کر جائے اور عمل اس کی تصدیق کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (الحجرات ۱۵)

"حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہیں کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔"

متکلمین اور فلاسفہ کی ذہنی معرفت کو ایمان نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ہی ارباب تصوف کی روحانی لذت یابی کو ایمان کا نام دیا جا سکتا ہے اور نہ مجرد سلوک و عبادت کو ایمان کا درجہ دیا جا سکتا

ہے جیسا کہ زاہدوں کا شیوہ ہے ایمان ان تمام کا مجموعہ ہے جو افراط و تفریط کے نقائص سے محروم ہے جس کے پیش نظر اس سرزمین میں حق و انصاف کی آبادی خیر و اصلاح کی بڑھوتری اور رشد و ہدایت کی طرف انسان کی رہنمائی ہے۔

اسی طرح مومنوں کے اعمال سے ملتے جلتے اعمال اختیار کرتے رہنے کو بھی ایمان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ دجل و فریب کے علمبردار نیک اعمال کو شعار بنا کر لوگوں کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں ایسے لوگوں کا دل صلاح و خیر سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

اخوان المسلمون نے اپنے طریقہ تربیت میں اس بات کی کوشش کی کہ متکلمین، فقہاء اور صوفیاء نے ایمان کے جو صحیح مراتب قائم کئے ہیں انہیں یکجا کیا جائے۔ دور اخیر میں مسلمانوں نے جن چیزوں کو چھوڑ دیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ شکست و ریخت سے دوچار ہوئے انہیں از سر نو اختیار کیا جائے۔ اس کے لیے اخوان نے ایمان کے شفاف و شیریں چشموں کی طرف رجوع کیا یعنی کتاب اور سنت نبویؐ پر مضبوط ایمان، جس میں وہ ستر سے زائد شعبے بھی شامل ہیں جن کی طرف حضور پاکؐ نے اپنی مشہور حدیث میں اشارہ فرمایا ہے۔

چنانچہ صحابہ کرام، تابعین عظام، اور سلف صالحین کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ قلب کے اعتقاد اور زبان کے اقرار کے ساتھ ان کے اعضاء و جوارح بھی اس کی تائید کرتے تھے۔ ان کی پوری زندگی پر ایمان کی گہری چھاپ تھی مسجدوں، مدرسوں، گھروں اور سوسائٹیوں میں، خلوت و جلوت میں شب و روز کی مصروفیات میں، آخرت کے کاموں اور خالص دنیاوی کاروبار میں ہر جگہ ان کے ایمان کی جھلک موجود تھی۔ اسی پھیلاؤ اور گہرائی کی وجہ سے اخوان کا ایمان ممتاز و منفرد تھا نیز زندگی، زبردست قوت اور فعال حرکت اس ایمان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ایمان ایک شعلہ ہے جو دلوں کو دہکا دیتا ہے، ایک آندھی ہے جو خس و خاشاک کو اڑا لے جاتی ہے ایک نور ہے ضوفشاں اور برو برگ و بار باطل کو بھسم کر دینے والی آگ!

## ایمان کی تابناکی دل زندہ پر منحصر ہے :

اس ایمانی تربیت کا دارومدار اس دل پر ہے جو اللہ سے مضبوط تعلق رکھتا ہو، اس سے ملاقات اور حساب کتاب پر کامل یقین ہو، اس کی رحمتوں کا طلبگار اور اسکی سزاؤں سے خائف ہو۔ درحقیقت انسان اس کے مادی وجود، اس کے اعضاء وجوارح اور ہڈیوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس ایمانی لطافت کا نام ہے جو اس مادی وجود کو ساکن و متحرک کرتی رہتی ہے اس کو حکم دیتی اور روکتی ہے اس میں خرابی آجائے تو پورا جسم فساد کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ دل ہے جسے روح فواد یا جس نام سے چاہے پکار لیجئے

یہی وہ باشعور حصہ ہے جو انسان کی زندگی کی حقیقتوں سے جوڑتا اور اسے عالم وجود کے اسرار و رموز سے واقف کراتا ہے۔ اسے عالم ہست و بود سے آسمان کی طرف لے جاتا ہے کائنات سے اس کی خالق کی طرف منتقل کرتا اور عالم فنا سے عالم خلود تک پہنچا دیتا ہے۔

یہی دل زندہ... تجلیات ربانی کا مشاہدہ کرتا ہے یہی چیز اللہ کی نگاہ میں قابل اعتماد اور لائق توجہ ہے مشہور حدیث ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ

"اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں پر نگاہیں رکھتا ہے۔"

سورۂ شعراء میں اللہ نے فرمایا :

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝

"جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔"

## دل مردہ دل نہیں ہے :

اگر دل میں ایمان کی انگیٹھی نہ دہک رہی ہو، یقین کے شعلے نہ گرم ہوں تو وہ دل مردہ ہے جس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں :

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الانعام: ۱۲۲)

"یا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے کہ جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نکلتا نہ ہو؟"

اسی وجہ سے اخوان المسلمون نے تربیت و اصلاح کا سارا زور دلوں کو زندہ کرنے پر صرف کیا تا کہ ان پر سے مردنی ختم ہو سکے، ان کی آبادکاری کا انتظام کیا تا کہ "خانہ خالی را دیو می گیرند" کے مصداق غیر اللہ کی یادیں اپنا آشیانہ نہ بنا سکیں، ان میں سوز و گداز پیدا کیا تا کہ قساوت و سنگدلی کا خاتمہ ہو سکے اسی لیے دلوں کی قساوت اور آنکھوں کا جمود اللہ کی جانب سے سزا تصور کی جاتی ہے جس سے ہمیشہ اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے، یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی بداعمالیوں پر اللہ نے ان کے دل سخت کر دیے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً (المائدہ ۱۳)

"پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔"

ایک دوسری جگہ انہیں یوں ملامت کی :

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً

(البقرۃ ۷۴)

"پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے۔"

سورہ حدید میں اللہ نے اہل ایمان کو ان الفاظ میں جھنجھوڑا:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (۱۶)

"کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔"

حضور کریمؐ اپنی دعاؤں میں غیر نافع علم اور نہ پگھلنے والے دل سے پناہ مانگا کرتے تھے حسن البنا شہیدؒ کے رسائل، مقالات، گفتگوئیں، عوامی میٹنگوں میں ان کی تقریریں، کنبوں، گھرانوں اور قوم کے لوگوں میں ان کی باتیں، سب کا مرکز و محور انسانی دل ہوتے تھے وہ اپنی پوری توجہ اس بات پر صرف کرتے تھے کہ دلوں میں اللہ کی معرفت جڑ پکڑے وہ اپنے رب کی رحمتوں سے متوقع اس کی انعامات کا امیدوار اور اس کے غرض اور اس کی سزاؤں سے خائف رہے اس کا دست سوال اسی کی طرف اٹھے۔ بھروسہ اسی پر کرے۔ محبت ہو تو اسی سے۔ خوشنودی کی طلب ہو تو صرف اسی کی، اسی کے قرب سے سکون و طمانیت حاصل کریں، اسی کی یاد میں اسے لذت و فرحت کا احساس ہو:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد ۲۸)

"خبردار رہو اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا

ہے۔"

درحقیقت اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جو سنگدلی کی رقت و نرم دلی سے، زندگی کے جام تند تلخ کو شیرینی و حلاوت سے، مشکلات و مصائب کو وصال یار کی لذتوں سے اور فی سبیل اللہ کے سرور سے بدل دیتی ہے۔ جیسے کوئی عاشق معشوق تک پہنچنے کے لیے سفر کی زحمتوں اور کلفتوں کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے اور اپنی بھوک و پیاس بھول جاتا ہے اگر اسے حبیب سے ملاقات کی آرزو ہوتی ہے جیسا کہ ابن قیم نے کہا ہے :

لها احاديث من ذكرك تشغلها عن الطعام و تلهيها عن الزاد

"تمہارے ذکر سے اس کی زبان تر رہتی ہے، اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا اور زاد راہ سے غافل ہو جاتی ہے۔"

ایسا شخص زبان حال سے کہتا ہے :

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

انسانی جسم کی طرح صالح دل کو بھی تین چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

۱۔ مکمل حفاظت۔ ۲۔ زندہ رہنے کے لیے روحانی غذا۔ ۳۔ بیماریوں سے بچانے کے لیے علاج۔

## دلوں کو مادہ پرستی سے بچائیے :

سب سے پہلی چیز جس سے قلب سلیم کو بچانا ضروری ہے، دنیا کی بے جا محبت ہے۔ یہی تمام برائیوں کی جڑ اور فتنہ و فساد کا سرچشمہ ہے۔ دولت کی بے جا ہوس، اقتدار کی ناجائز بھوک اور کرسیوں کی بڑھتی ہوئی طلب نے ساری دنیا کو جہنم کا نمونہ بنا کر رکھ دیا ہے اور اس کا توڑ صرف آخرت پر یقین پیدا کرنے اور اخروی انعامات کو ذہنوں میں بٹھانے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیوی وسائل کی ناپائیداری اور اخروی نعمتوں کی ابدیت اور ہمیشگی ذہنوں

میں بٹھائی جائے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل: ۹۶)

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔"

ایک مومن کی تربیت کے لیے وہ قرآنی آیات کافی ہیں جن میں دنیوی و اخروی نعمتوں کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ سورہ آل عمران میں دیکھئے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (3:14)

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ (العمران ۱۵:۳)

"لوگوں کے لیے مرغوبات۔ نفس۔ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں۔ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے کہو: میں تمہیں بتاؤں ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں ہمیشگی زندگی حاصل ہوگی پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے وہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔"

ان مادی مرغوبات۔۔۔۔ بطن و فرج کی پکار اور مال اور اولاد کی اندھی محبت۔۔۔۔

سے کہیں زیادہ پُرخطر اور مہلک دل کے شہوات اور اس کی ناجائز خواہشات ہیں۔ ہوا و ہوس نفس بدترین خدا ہے جس کی اس سرزمین پر عبادت کی جارہی ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (القصص ۵۰)

"اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟)

جاہ و اقتدار کی ہوس، بندگان خدا پر اپنی خدائی جمانے کی حرص، نام و نمود اور شوکت و دبدبہ کے لیے دوڑ دھوپ، کمزوروں کو دبانے اور چودھریوں کی خوشامد کرنے کے لیے چلت پھرت اور اس نوعیت کی دیگر کوششیں دل کو اندھا، بہرہ اور گونگا کر دیتی ہیں۔ اسے زندگی سے محروم کر دیتی اور تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ انہی چیزوں کو امام غزالی نے "احیاء العلوم" میں "مہلکات" (تباہ کن چیزیں) سے تعبیر کیا ہے۔ حضور کریمؐ کا ارشاد ہے:

ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ شُحٌّ مُطَاعٌ، وَهَوًى مُتَّبَعٌ، وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ

(حدیث)

"تین چیزیں بڑی تباہ کن ہیں، بخل، جو قابل اطاعت بن جائے، خواہش جس کی اندھی تقلید کی جائے اور آدمی کا اپنا گھمنڈ۔"

بڑے افسوس کی بات ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد ان مہلکات سے بے خبر ہے وہ اپنی تمام تر طاقت اور توجہ ظاہری مہلکات مثلاً چوری، زنا، شراب وغیرہ کو ختم کرنے پر صرف کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی ہلاکت خیزی مسلم ہے لیکن اوپر کی معنوی مہلکت کے مقابلے میں ان کا نقصان کم اور خطرہ معمولی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام محسوس کی جانے والی تباہ کن چیزوں کے پرے نفسیاتی بیماری کام کر رہی ہے جسے اہل نظر خوب جانتے ہیں اسی وجہ سے دعوت اسلامی نے آغاز کار سے ہی دلوں کو تمام دنیاوی مرغوبات سے کاٹ کر اللہ کی طرف سے موڑنے کا اہتمام کیا اور ہر قسم کے

فائدہ و لالچ جو اللہ کے یہاں کچھ بھی نفع بخش نہیں ہوگا، سے نفوس کو پھیرنے کا انتظام کیا۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ دعوت نے اپنا رخ خدا پرستی کی طرف رکھا اس کے لیے فضا ہموار کی اور وسائل مہیا کئے اور افکار و احساسات کو اسی کے سانچے میں پروان چڑھایا۔

انقلابی ایمان کا یہ پہلو اخوان کے تربیتی پروگرام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کا نہایت درجہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے دعوت، سب سے پہلے خدا پرستی اور ایمان کی دعوت ہے اور ایمان کی دعوت اللہ وحدہ لاشریک کو ہی اپنا منزل مقصود بنانے سے اسی کی خوشنودی اس کی تمام سرگرمیوں کا اصل مرکز ہوتی ہے :

کیا غم ہے جو ہے ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اللہ تعالیٰ شکلوں اور صورتوں کو نہیں دیکھتا، دلوں کا اعتبار کرتا ہے اور ظاہری اعمال کے حجم کے لحاظ سے جزا نہیں دیتا بلکہ ان اعمال کی تہ میں کام کرنے والے اخلاص کا بدلہ دیتا ہے اس کی بارگاہ میں وہی عمل مقبول ہوتا ہے جو خالص اسی کے لیے انجام دیا گیا ہو۔ وہ شرک سے تمام بے نیازوں سے زیادہ بے نیاز ہے اور ریا اور نمود کی شرک خفی کہا گیا ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ مشرکانہ اعمال اور مشرک دل سے ذرا بھی لگاؤ نہیں رکھتا۔ مشترک اعمال کو قبول نہیں کرتا نہ ہی مشترک دل کی طرف متوجہ ہوتا ہے :

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (الکہف:۱۱۰)

"پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔"

اسی وجہ سے یہ بات باعث تعجب نہیں کہ اخوانیوں نے اپنا شعار "اللہ اکبر ولله الحمد" کو بنایا اور اپنا اولین نعرہ، جس کی وہ اپنے پیروکاروں کو تلقین کرتے اور جس کا مقصود

مفہوم ان کے عقلوں اور دماغوں میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "اللہ غایتنا" اللہ ہی ہمارا مقصود ہے۔" کو بنایا۔

رسالۃ التعالیم میں حسن البنا شہید نے "فہم" کے بیس اسلامی اصولوں کا تذکرہ کرنے کے بعد بیعت کا دوسرا رکن "اخلاص" ہی کو قرار دیا ہے۔ ان کی تشریح یوں کی ہے:

"اخلاص سے مراد یہ ہے کہ ہمارے مسلم بھائی کے قول و عمل اور اس کی ساری سرگرمیوں کا مقصد بس خدا کی خوشنودی، رب کی رضا جوئی اور آخرت کی کامرانی ہو۔ وہ کسی مال غنیمت کا حریص نہ ہو، وہ کسی اقتدار یا جاہ و منصب کا بھوکا نہ ہو وہ کسی طرح کے خطابات و القابات کا امیدوار نہ ہو، نیز وہ اپنی کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کی طرف سے بالکل بے پروا ہو کہ بس اسی صورت میں وہ اغراض و منفعت سے بلند ہو کر "عقیدہ و نظریہ" کا بے باک سپاہی بن سکے گا۔"

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ (الانعام ۱۶۲،۱۶۳)

"کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔"

دلوں کے امراض اور نفوس کی بیماریوں کے عارفین جانتے ہیں کہ دعوت اسلامی کے مردان کار کے لیے سب سے بڑا خطرہ شہرت و ناموری کی خواہش، آگے بڑھنے اور لیڈری چمکانے کا فتنہ ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریمؐ نے جاہ و مال کی محبت اور شرک خفی یعنی ریا و نمود کی خواہش سے ہوشیار کیا ہے اور قرآن و سنت نے ان مخلص کارکنوں کی ہمت افزائی کی ہے جو اپنی تمام سرگرمیوں کو محض اللہ کی رضا کے لیے انجام دیتے ہیں اور کسی سے بدلہ لینے اور شکر ادا کرنے

کی توقع نہیں رکھتے۔ رسول کریمؐ نے اس خاموش تعمیری مسلمان کو شاباش دی ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر فرائض بجالاتا ہے اسے کوئی لائق توجہ نہیں سمجھتا فرمایا:

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَهُ لَهٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ

(حدیث)

"کتنے ہی افراد ہیں گرد و غبار میں اٹے ہوئے۔ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس، جن کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی لیکن اگر وہ قسم کھالیں تو اسے اللہ پورا کر دے۔"

"خوش نصیب ہے وہ مجاہد، جو اللہ کی راہ میں گھوڑے کی لگام پکڑتا ہے اس کے سر کے بال ژولیدہ اور قدم غبار آلود ہوتے ہیں اگر اسے محافظوں میں شامل کر دیا جائے تو اسے کوئی بہت زیادہ خوشی نہیں ہوتی اور اگر اسے فوج کے پچھلے دستے میں رکھ دیا جائے تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔"

خدا رحم کرے خالد سیف اللہؓ پر جنہوں نے فوجوں کی قیادت کی تو پوری ذمہ داری کا ثبوت دیا اور ایک عام فوجی کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہوئے تو کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہ ہونے دیا۔

اخوان المسلمون نے اپنی تربیت و تزکیہ میں ان تمام چیزوں کا سختی سے اہتمام کیا اور قیادت کی محبت سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جو اکثر ترقی کے دروازے بند کر دیتی ہے۔

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جماعت میں "گمنام فوجیوں" کی ایک کثیر تعداد ابھری یا جنہیں حدیث میں ان صفات سے پکارا گیا ہے۔

اَلْاَبْرَارُ الْاَتْقِیَاءُ الْاَخْفِیَاءُ الَّذِیْنَ اِذَا غَابُوْا لَمْ یُفْتَقَدُوْا وَاِنْ حَضَرُوْا لَمْ یُعْرَفُوْا

"نیک، متقی اور چھپ کر رہنے والے لوگ، جو غائب ہو جائیں تو ان کی تلاش نہ ہو اور اگر موجود ہوں تو پہچانے نہ جائیں۔"

اور اسی تربیت کا کرشمہ تھا کہ ہم نے ان میں انصار مدینہ کی یہ صفت دیکھی

یکثرون الفزع ویقلّون عند الطمع

جنگ کے وقت بھاری تعداد میں موجود ہوتے ہیں اور مال غنیمت کے وقت کم تعداد میں۔"

کتنے ہی ایسے افراد تھے جنہوں نے اپنی دولت اور اپنی جانیں قربان کر دیں حالانکہ ان کا نام بھی نہیں لیا جاتا یا ان کی شخصیتوں کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا اور کتنے ہی ایسے نوجوان تھے جنہوں نے فلسطین اور نہر سویز کے محاذوں پر جنگ کی اور سورماؤں کے درخشاں کارنامے انجام دیئے حالانکہ انہیں کسی شاباشی یا زندہ باد کی ادنیٰ خواہش بھی نہ تھی، انہوں نے اپنی بہادری کا چرچا کیا نہ اپنے کمالات گنوائے۔ محض اس ڈر سے کہ مبادا غرور یا تکبر کی وجہ سے ان کے اعمال خدا کے ہاں اکارت ہو جائیں۔

## روحانی غذا فراہم کیجئے :

اس کے بعد تحریک کی ذمہ داری ہے کہ وہ دلوں کو اس مرض مزمن سے بچانے کے بعد اس کی روحانی غذا کا بندوبست کرے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ سے مضبوط و پائیدار تعلق کے ذریعہ ہی ممکن ہے، اس کے ذکر و شکر کی انجام دہی اور اس بہترین عبادت کرنے سے ہی روحانی غذا مل سکتی ہے۔

اسی وجہ سے اخوان کی ایمانی تربیت کی اساسی بنیاد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ انسانوں کی تخلیق کا اولین مقصد یہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ۵۶)

"میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

عبادت اپنے عام معنوں میں ان تمام اقوال و اعمال پر مشتمل ہے جو اللہ کو محبوب اور

پسندیدہ ہیں یہاں عبادت سے میری مراد اس کا خاص مفہوم ہے یعنی اس کے شعائر کی اقامت اور ذکر و شکر کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرنا اور مراسم عبودیت بجالانا۔

عبادت کے سلسلے میں اخوان نے جن بنیادی عناصر کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہیں :

۱۔ سنت کا التزام اور بدعت سے اجتناب، اس لیے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس موضوع پر برادر محترم سید سابق نے اپنی کتاب "فقہ السنہ" لکھی ہے جس کا مقدمہ حسن البنا شہیدؒ نے لکھا ہے اور اس کی تعریف کی ہے اس سے پہلے اس کے کچھ حصے اخوان کے ہفتہ وار مجلہ میں چھپ چکے ہیں زیر بحث کتاب نے شرعی دلائل کا سہارا لیا ہے اور اخوان کے فقہی مسلک کی بہترین نمائندگی کی ہے۔

۲۔ فرائض کا اہتمام، اللہ تعالیٰ نوافل کو قبول نہیں کرتا جب تک فرائض کی ادائیگی نہ ہو، امام بخاری کی روایت ہے کہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "میرے بندے کے لیے مجھ سے قریب ہونے کا فرائض کی ادائیگی سے زیادہ محبوب طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔" اس لیے فرض کی تکمیل میں کسی طرح کی سستی یا کاہلی کی گنجائش نہیں ہے۔"

۳۔ نماز باجماعت کی ترغیب، جو اختلاف مسالک کے مطابق یا تو فرض عین ہے یا فرض کفایہ ہے یا سنت موکدہ ہے یہی وجہ ہے کہ اخوان جب طور کے جیل خانہ میں پہنچے تو انہوں نے فوراً ہر بیرک میں مسجد قائم کی جس میں پنج وقتہ نمازوں کے لیے وہ حاضر ہوتے اور نماز جمعہ بھی وہیں ادا کرتے۔ مجھے شیخ محمد غزالی کی دعائیں اب تک یاد ہیں جو ہر نماز میں ہماری امامت کرتے تھے اور آخری رکعت میں دعائے قنوت پڑھتے تھے :

"اے اللہ! ہماری بیڑیوں کو اپنی طاقت سے توڑ دے اور اپنی رحمت خاص سے ہمارے زخموں پر مرہم رکھ دے اور اپنی عنایت سے ہمارے معاملے کی نگہداشت کر، اے اللہ تو ہماری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے اور ہر قسم کی

دھمکیوں سے انہیں محفوظ رکھے۔"

۴۔ نوافل کی تشویق، اوپر جو حدیث قدسی گزر چکی ہے اس میں ہے کہ "میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ تک قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں۔" اس دعوت کے محاذ پر کتنے ہی ایسے نوجوان تیار ہوئے جو روزہ رکھنے والے اور مستقل قیام کرنے والے تھے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا

(السجدۃ:۱۶)

"ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔"

انہیں وہی خطاب دیا گیا جو اس سے پہلے صحابہ کرام اور تابعین عظام کو دیا گیا تھا یعنی یہ کہ وہ رات کے راہب اور دن کے مجاہد ہیں ان کے ایک شاعر نے اپنے ایک ترانے میں ان کی خصوصیات انہیں کی زبان میں یوں بیان کی۔

"شریف لوگ ہیں جب رات کی تاریکی ہم کو ڈھانپ لیتی ہے تو ہم محرابوں سے چمٹ چمٹ کر روتے اور آنسو بہاتے ہیں!!

اور ہم سخت دل قوی ہیں اگر کوئی ہمیں کسی جنگ کے لیے ابھارتا ہے تو ہم وہ شیر ہوتے ہیں جو کمزوری نہیں دکھاتا"

اسی سلسلہ میں مرشد شہیدؒ نے رسالہ "مناجاۃ" تحریر کیا جس میں تہجد اور رات کے پچھلے پہر کی نمازوں کی فضیلت، دعا و استغفار کی اہمیت اور اس سلسلہ کی آیات و احادیث اور آثار کا تذکرہ کیا ہے۔ خود مرشدؒ رات کی تاریکیوں میں جب لوگ نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں، تہجد، عبادت گزاری اور قیام کا لطف اٹھاتے تھے، دن کے اجالے میں جب کہ لوگ لہو و لعب میں غرق ہوتے ہیں، خدا کی اطاعت میں مست رہتے تھے، اور اللہ کے ڈر سے نیک بندوں کی

طرح رو پڑتے تھے جبکہ خطا کار مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے رب سے دعا و مناجات میں شاعر کے اس شعر کے ہم آواز تھے۔

وہ آنکھ جو تیری خوشنودی کے سوا دوسرے مقصود کی خاطر جاگے بیکار ہے
اور تجھ کو چھوڑ کر کسی اور کے کھو جانے پر اس کے آنسو ضائع و برباد ہیں

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے :

وہ دل جس میں تیری یاد بسی ہو
اسے کسی چراغ کی ضرورت نہیں رہتی
تیری متوقع رضا ہماری سب سے بڑی دلیل ہو گی
جس دن لوگ دلائل کے انبار لائیں گے

ان تمام باتوں نے اخوان کی عقلوں اور ان کے دلوں پر گہرے اثرات چھوڑے۔ چنانچہ ایک ایسی خدا پرست نسل پروان چڑھی جو محض اللہ کے لیے اپنی راتیں جاگتی تھیں اور اس کی خاطر دن کو بھوک پیاس برداشت کرتی تھی۔ ٹھنڈک کی شدت اسے قیام سے روک سکتی تھی نہ چلچلاتی دھوپ اور آفتاب کی تمازت اسے روزہ رکھنے سے منع کر سکتی تھی اس لیے کہ اسے اپنے رب کی عبادت میں مزہ آتا تھا، اس کی اطاعت میں لذت ملتی تھی اور اس کے حضور کھڑا ہونا اپنی خوش نصیبی سمجھتی تھی۔ اس صورت حال کی بہترین تعبیر کسی مرد بزرگ کے اس قول میں ہے کہ "اگر بادشاہوں کی اس لذت و سعادت کا پتہ چل جائے تو اس جرم میں وہ ہماری گردنیں ناپ دیں۔"

مجھے جبل خانہ طور کے تہجد گزاروں کی صفیں ہمیشہ یاد رہیں گی جہاں رات کے تہائی حصہ میں کوئی اخوانی موثر آواز میں یوں صدا لگاتا :

یا نائما مستغرقا فی المنام
قم فاذکر الحی الذی لا ینام
مولاک یدعوک الی ذکرہ

وانت مشغولٌ بطيب المنام

"اے سونے والے، نیند میں ڈوبے ہوئے شخص اٹھ جا، اسی زندہ ہستی کو یاد کر جو سوتا نہیں ہے تیرا آقا تجھے اپنے ذکر کی طرف بلا رہا ہے اور تو ہے کہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔"

چنانچہ سونے والا بیدار ہو جاتا، بوجھل فرد ہلکا ہو جاتا اور سست طبیعت کا آدمی اٹھ بیٹھتا تا کہ رات کی اس مبارک گھڑی میں اللہ کی پاکیزہ خوشبو پا سکے اس توقع کے ساتھ کہ اسے بھی "سحر میں مغفرت چاہنے والوں" کی برکت میسر آجائے۔

یہ شبینہ اسکول...... جس میں نماز، دعا، قرآن کی تلاوت اور ترتیل کا انتظام تھا جس میں روح کو غذا اور قلوب کو توشہ فراہم ہوتا تھا...... یہی ایسے مسلم فارغ کرتا ہے جو رسالت کے بوجھ اور نبوت کی وراثت کو قوت اور ایمانداری کے ساتھ سہار سکے۔ جس طرح نبی کریمؐ نے اس بوجھ کو اٹھایا تھا جنہیں مکی دور کے آغاز دعوت ہی میں کہا گیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا

(المزمل ۱۔۵)

"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔"

اس مدرسہ شبینہ وقرآن سے ایسے نوجوان فارغ ہو کر نکلے جو سچے خدا پرست تھے جنہوں نے ازسرنو اسلاف کے زندہ نمونے ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ ہم نے ان ربانی نوجوانوں میں ایسے لوگوں کو بھی پایا جنہوں نے اپنی پوری زندگی سوموار اور جمعرات کو پابندی سے روزہ رکھنے کا اہتمام کیا۔ اللہ ہمیں ان کے ذریعہ فائدہ پہنچائے اور ایسے نوجوان بھی کثیر تعداد میں تیار ہو کر نکلے

جنہوں نے نبیؐ کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے میدان جہاد میں بھی اس سنت کی پابندی کی۔

مَنْ صَامَ يَوْمًا فِي سَبِيلِ اللهِ بَاعَدَ اللهُ بِذَلِكَ الْيَوْمِ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا (بخاری)

"جس نے اللہ کی راہ میں ایک دن کا روزہ رکھا تو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو جہنم کی آگ سے ستر سال تک دور رکھے گا۔"

انہیں مجاہد بھائیوں میں سے کوئی ایک بار روزے کی حالت میں زخمی ہوا اور عالم نزع میں اس کے پاس پانی کے چند قطرے لائے گئے کہ اس کی پیاس بجھ جائے تو اس نے کہا "رہنے دو" میں اپنے رب سے روزہ داروں کی حالت میں ملنا چاہتا ہوں۔"

۵۔ ذکر الٰہی پر ابھارنا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۝ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ (الاحزاب: ۴۱، ۴۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔"

سب سے بہترین ذکر اللہ کے کلام کی تلاوت ہے۔ اس کے ایک حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں۔ ہر اخوانی کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ روزانہ کتاب اللہ کا متعینہ حصہ تلاوت کرتا رہے اور احکام تجوید کے ذریعہ حسن تلاوت کی مشق کرے اور ٹھہر ٹھہر کر غور و تدبر کے ساتھ پڑھے۔ اگر کسی کتاب میں یہ اثر ہوتا کہ اس کے پڑھنے سے شیر بل اٹھیں زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے یا اس سے مردے زندہ ہو جائیں تو یہ قرآن عظیم ہوتا۔

ذکر کی قسمیں اور اسکی شکلیں بہت ہیں مثلاً تسبیح، حمد، تکبیر، تہلیل، دعا، استغفار اور درود سلام وغیرہ

اخوان کے تربیتی نظام میں مذکورہ تمام اذکار و اوراد میں مسنون دعاؤں کا بھی اہتمام کیا گیا

جس کی وجہیں بہت سی ہیں۔

۱۔ مسنون دعائیں اپنا ثانی نہیں رکھتیں نہ تو مضمون میں نہ اسلوب میں۔ یہ دعائیں جامعیت بلاغت وضاحت اور قوت تاثیر میں اللہ کی نشانیوں میں شمار ہوتی ہیں اور یہ نبوت کی برکت کا نتیجہ ہے۔

۲۔ غیر معصوم کلام میں مبالغہ آمیزی یا تقصیر و تفریط کے داخل ہونے کا امکان پایا جاتا ہے اس لیے عام انسانی کلام میں قیل و قال کی گنجائش ہوتی ہے لہٰذا مشتبہ و مشکوک چیزوں کو چھوڑ کر غیر مشتبہ چیزوں کو اختیار کرو۔

۳۔ مسنون ذکر میں دوہرا اجر ہے ایک تو ذکر کا دوسرا اتباع نبی کا۔ اسی لیے کسی عقلمند کے لیے یہ کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ مفت میں ملنے والے اتباع کا اجر ضائع ہونے دے۔

یہی وجہ ہے کہ مسنون دعاؤں اوراد اور وظائف پر مشتمل امام شہیدؒ نے ایک مجموعہ "المأثورات" کے نام سے تیار کیا جس میں امام نوویؒ کی تصنیف "الاذکار" اور ابن تیمیہؒ کی کتاب "الکلم الطیب" سے منتخب حصے شامل ہیں۔

کوئی اخوانی ایسا نہ ہوگا جس کے پاس یہ رسالہ نہ ہو اور شاید ہی کوئی ایسا نکل آئے جسے یہ دعائیں یاد نہ ہوں اور وہ انہیں صبح و شام دہراتا نہ ہو۔ ہمارے بہت سے بھائیوں نے موقع کی مناسبت سے ان دعاؤں کے یاد آجانے کا بہترین انتظام بھی کر رکھا ہے۔ کمرۂ شب خوابی میں سونے اور جاگنے کی دعائیں تختی پر آویزاں ہیں تو ڈائننگ ہال میں کھانے پینے کی دعائیں اور ان کے آداب لٹکا رکھے ہیں۔ دروازے پر گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعائیں ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں گاڑی میں سوار ہونے کی دعا انسان کو اس کی ذمہ داریاں یاد

---

اس کتاب کا اردو ترجمہ "تزکیہ نفس" اور اردو وظائف کا مجموعہ کے نام سے مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ ۴۰ اردو بازار لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

دلاتی ہیں وغیرہ۔

دینی شعور کی بیداری، ذاتی و انفرادی احساسات کی ترقی اور نفس امارہ پر نفس لوامہ کو غالب کرنے کے لیے جو وسائل اخوان نے اپنا رکھے ہیں ان میں ایک "محاسبہ چارٹ" بھی ہے۔ جس میں انسان کی روزمرہ کی زندگی سے متعلق سوالات درج ہوتے ہیں وہ ان سوالات کو اپنے آپ سے پوچھے اور "ہاں" یا "نہیں" میں اس کا جواب دے تاکہ اسے معلوم ہو اس نے ان اصولوں کی حفاظت اور پابندی کی ہے یا اس سے کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ محاسبہ کا یہ عمل اس وقت ہوگا جب وہ سونے کے لیے بستر پر چلا جائے تاکہ دن بھر کے کارناموں کا جائزہ لے سکے۔ یہ محاسبہ اس فرد کے اور اس کے نفس کے درمیان ہوگا جس کا نگران صرف اللہ ہوگا۔

چند سوالات یہ ہیں:

کیا آج تم نے تمام نمازیں ان کے صحیح اوقات میں ادا کی ہیں؟

کیا آج جماعت سے انہیں ادا کیا ہے؟

کیا آج قرآن سے اپنے متعین کردہ حصے کی تلاوت کی ہے؟

کیا آج مسنون دعائیں تم نے پڑھی ہیں؟

کیا آج اپنے کسی بھائی سے محض اللہ کے لیے ملاقات کی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس ربانی ایمانی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اخوانیوں نے اپنے ملک و وطن اور اپنی دعوت کی راہ میں بیش بہا قربانیاں دیں اور کسی پر احسان نہ جتایا بلکہ ان کا یہ احساس تھا کہ اللہ نے انہیں ایمان کی ہدایت سے نواز کر ان پر زبردست احسان کیا ہے۔ گرچہ شہنشاہیت کے دور میں پھر ناصر کے زمانے میں (۱۹۴۸ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۵ء) پے در پے انہیں آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر عذاب کے کوڑے برسائے گئے لیکن اللہ کی راہ میں پیش آنے والی یہ مصیبتیں ان کے عزم و ہمت کو چیلنج نہ کر سکیں وہ سست نہ پڑے، کمزور ثابت نہ ہوئے یہاں تک کہ ان میں سے کتنوں کو کتوں نے نوچا، کتنے ایسے تھے جن کی پیٹھیں سرخ سلاخوں سے داغ دی گئیں۔ بہتیروں

کے بدن کرین سے پھاڑ دیئے گئے۔ بہت سے عہد انقلاب میں مکمل بیس سال تک جیلوں میں پڑے رہے اور بہت سے ساتھی علی الاعلان گولیوں سے بھون دیئے گئے جیسا کہ لیمان طرہ کے "بوچڑ خانے" میں ہوا۔ ایسے افراد بھی کم نہ تھے جنہیں کوڑوں کی مار سے ختم کر دیا گیا اور ایسے مظلوم افراد کی دہائی کی تعداد میں میں ضروری ہے کہ ان پر سے پردہ ہٹایا جائے اور تاریخ انہیں جان لے۔ ایسے بھائی بھی ہیں جنہیں ناحق پھانسی پر لٹکایا گیا۔ حالانکہ اسلام لانے کے بعد وہ کفر کی طرف نہ پلٹے تھے۔ عفت و پاکدامنی کی لذت حاصل کرنے کے بعد زنا کو منہ نہ لگایا تھا اور ناحق کسی کی جان نہ لی تھی۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اللہ کو اپنا رب اور قرآن کو اپنا دستور مانتے تھے۔

تعجب اس پر نہیں ہے کہ انسان گناہ کر ڈالے بلکہ حیرت اس پر ہے کہ وہ گناہوں میں لت پت رہے اور توبہ کی توفیق نہ ہو۔ گناہ تو آدمؑ سے بھی ہوا تھا لیکن اللہ نے ان کی توبہ سن لی اور انہیں بخش دیا۔

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (طٰہٰ ۱۲۱، ۱۲۲)

"آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا پھر اسکے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے وہدایت بخشی۔"

لیکن ابلیس نے گناہ کیا تو اس کی بخشش نہیں ہوئی اس لیے کہ اس نے توبہ نہیں کی اور اپنے رب سے معذرت نہیں چاہی بلکہ انکار کیا اور اس پر اڑا رہا۔ اس نے کہا "میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔" جبکہ آدمؑ اور ان کی بیوی نے یوں دعا کی:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (اعراف: ۲۳)

"اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ

فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی سے سرزد ہونے والا گناہ ایک عارضی غفلت کا نتیجہ تھا جس کے بعد انہوں نے سچی توبہ کی تو اللہ نے قبول کر لی اور اپنی رحمت و مغفرت کا مستحق قرار دیا۔ اور ابلیس کا گناہ اللہ کے خلاف سرکشی اس کے احکام کے لیے اسے ملعون و مردود قرار دے دیا گیا۔

## دل کے علاج کی فکر کیجئے :

اخوان بھی آدم کی اولاد ہیں اس لیے یہ امر باعث حیرت نہیں کہ ہمیں ان میں سے کوئی خطا کار مل جائیں جو احکام و اوامر کی خلاف ورزی کرتے ہوں تو منہیات کا ارتکاب کرتے ہوں۔ لیکن بہترین خطا کار ہیں وہ لوگ جو خطا ہونے کے بعد سچے دل سے توبہ کریں اور اپنے رب سے مغفرت چاہیں اور یہی وہ علاج ہے جس سے دلوں کو بیماریوں سے نجات دلایا جا سکتا ہے۔

توبہ بالکل سچی ہونی چاہیے، استغفار صادق ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ گناہ کا احساس ہو۔ رب کی سزاؤں کا ڈر ہو اور سچے جذبہ عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے گریہ وزاری ہو اور اعتراف کی انکساری بھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود اخوان نے تمام مصیبتیں صرف اللہ کے لیے برداشت کیں اور اس کی خاطر قربانیاں دیں۔ انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ کے لیے بیچ دیا اور اللہ نے جنت کے عوض انہیں خرید لیا اور انہوں نے اس معاہدہ کو فسخ نہ کیا نہ اس سے پھرے اور انشاء اللہ آئندہ بھی ایسا نہیں کریں گے۔ جنت کے بدلے میں انہیں کوئی چیز گوارا نہ ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جن ظالموں نے انہیں قید خانے کی تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس کیا، انہیں ہر طرح کے عذاب میں مبتلا کیا، ان کے اموال لوٹے، ان کے بال بچوں کو بھوک سے تڑپایا اور ان میں سے بہتیرے قتل کر ڈالے گئے لیکن ان سے انتقام لینے کا خیال تک اخوان کے دل و دماغ میں نہ آیا۔ کسی نے نہیں سنا کہ انہوں نے کسی جلاد پر حملہ کیا ہو اور اس کے دائیں یا

بائیں آنکھ میں گولی چلائی ہو حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ ان میں ایسے تربیت یافتہ فوجی بھی تھے جنہوں نے یہودیوں کی ناک میں دم کر دیا تھا اور انگریزوں کی نیندیں حرام کئے ہوئے تھے لیکن ان کی ایمانی تربیت نے اسطرح کے کسی اقدام کی اجازت ہرگز نہ دی۔ بلکہ اپنے دشمنوں کا معاملہ انہوں نے اللہ کے حوالے کر دیا۔ اللہ نے ان میں سے ہر ایک سے یکے بعد دیگرے انتقام لیا۔ آخرت سے پہلے اس دنیا میں ان کی پکڑ کی اور قیامت کے دن ان کا جو انجام ہو گا وہ تو تصور سے باہر ہے۔

خدا کے غضب کو دعوت دی گئی تھی چنانچہ اخوان نے اپنی آنکھوں سے بہت سے جلادوں کا حشر اسی دنیا میں دیکھ لیا کہ وہ کسی طرح ذلت و رسوائی سے دوچار ہوئے، کوڑھی اور پاگل ہو گئے یا قتل کر دیئے گئے اور اپنے انجام بد کو پہنچے حتیٰ کہ استاذ الہضیبیؒ نے اپنی زندگی میں دیکھا کہ جن لوگوں نے انہیں جیل میں ڈالا تھا وہ خود استاذ مرحوم اور ان کے دوستوں کے ساتھ جیل میں دھکیلے جا رہے تھے اور داخل ہوتے وقت بچوں کی معصوم مسکراہٹ سے کیا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اخوان تمام کے تمام ایمان کے اس بلند مقام پر فائز ہیں بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ایمان کی روشن چھاپ ان کے اوپر گہری ہے اور ان میں سے اکثریت کی محافظ ہے۔ اطاعتو فرمانبرداری ان کی عام روش ہے جب کہ معصیت کا وجود شاذ ہے۔ شہوات دنیا سے بے نیاز ہو کر اور چند روزہ فوائد کو نظر انداز کر کے انہوں نے آخرت کا توشہ جمع کرنے کی کوشش کی۔ اور ذاتی منفعت سے بلند ہو کر عوامی مسائل کو اپنے سامنے رکھا۔ اب ان میں سے جس کو شیطان نے بہکایا تو اس کے قدم پھسل گئے لیکن جلد ہی اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور اس کا دل ہوش میں آجاتا ہے اور وہ رونے، گڑگڑانے لگتا، ندامت کے ساتھ اپنے رب کی مغفرت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

مجھے ایک نوجوان کی پریشانی اب تک یاد ہے وہ آغاز جوانی کی عمر میں تھا اس پر چند لمحوں کے لیے غفلت طاری ہو گئی اور نفس امارہ غالب آ گیا تو وہ معصیت میں مبتلا ہو گیا پھر یک بیک

اسے ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ گندگی میں لت پت ہو چکا ہے اور صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کے راستے جا پڑا ہے اور اسے گناہ کی تلخی کا احساس ہوا جبکہ وہ اطاعت کی حلاوت کا مزہ چکھ چکا تھا۔ اس کا یہ احساس اس قدر بڑھا کہ وہ اپنے گھر میں چھپ گیا بہت دنوں تک روتا اور فرش پر لوٹتا رہا زمین اپنی وسعت کے باوجود اس پر تنگ ہو گئی خود اس کا دل اس کے لیے تنگ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے احباب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور اپنے رب سے شرم کی وجہ سے، اپنی ندامت اور ساتھیوں سے فرار اختیار کرنے کے لیے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا حالانکہ اس کے احباب میں سے کسی کو اس حادثہ کی اطلاع نہ تھی، اگر میں نے اس کے پاس نہ لکھ بھیجا ہوتا کہ وہ توبہ اور استغفار کے ذریعہ اپنے رب کی رحمت کے دروازے کھٹکھٹائے۔ میں نے اسے رسول کریم کی حدیث یاد دلائی کہ "جس کو اس کی نیکیاں خوش کر دیں اور اس کی برائیاں اس کو مغموم کر دیں وہی مومن ہے۔" اور یہ قول بھی کہ "وہ برائی جو تجھے مغموم کر دے اس نیکی سے اچھی ہے جو تجھے گھمنڈ میں مبتلا کر دے۔" ابن عطاء اللہ کے اس قول کا بھی تذکرہ کیا کہ "بسا اوقات تمہارے لیے اطاعت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے لیکن قبولیت کا دروازہ نہیں کھولا جاتا اور کبھی کبھی تم سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔ جو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ گناہ جس کے نتیجہ میں پستی و انکساری پیدا ہو اطاعت سے بہتر ہے جو تکبر و غرور کے ابھرنے کا سبب بنے۔"

# فصل (۲)

## جامعیت

تربیت کسی ایک شعبے تک محدود نہیں

فکری تربیت

اخلاقی تربیت

جسمانی تربیت

مجاہدانہ تربیت

اجتماعی تربیت

سیاسی تربیت

"جس وقت تم میں سے تین سو ایسے دستے تیار ہو جائیں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو تیار کر چکا ہو۔ روحانی طور پر ایمان اور عقیدہ کی طاقت سے مسلح ہو، فکری طور علم و ثقافت کے جوہر سے آراستہ ہو اور جسمانی طور پر ریاضت اور عسکری تربیت میں کامل ہو چکا ہو۔ اس وقت تم مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو کہ تمہیں لے کر سمندر کی پہنائیوں کو چیر جاؤں، آسمان کی بلندیوں کو جا لوں اور ہر باطل قوت سے ٹکراؤں اس وقت ایسا کرنے میں مجھے ان شاء اللہ کوئی باک نہ ہوگا۔"

حسن البنا شہیدؒ

## تربیت کسی ایک شعبے تک محدود نہیں :

اسلامی تربیت کی دوسری اہم خصوصیت، جیسا کہ اخوان نے سمجھا اور اختیار کیا، جامعیت اور ہمہ گیریت ہے۔

کیونکہ اسلامی تربیت انسان کے ایک گوشے پر ہی پوری توجہ صرف نہیں کرتی بلکہ اس کے تمام گوشوں پر توجہ دیتی ہے صرف روحانی اور اخلاقی گوشہ ہی اس کے نزدیک تربیت کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ ارباب تصوف اور معلمین اخلاق کرتے ہیں۔ صرف فکری ارتقاء پر ہی پوری محنت صرف نہیں کردیتی جیسا کہ فلاسفہ اور عقل پرست حضرات کرتے ہیں۔

فوجی و عسکری ریاضت بھی اس کی تمام تر توجہات کو اپنی طرف نہیں کھینچتی، جیسا کہ فوجی معلمین کا رویہ ہوتا ہے۔

نہ ہی اجتماعی تربیت تک اسکی سرگرمیاں محدود ہیں جیسا کہ "اجتماعی معلمین" کا کارنامہ ہے۔

اسلامی تربیت درحقیقت ان تمام پہلوؤں کا خیال رکھتی ہے اور تربیت کے ان تمام گوشوں کو اپنے دائرہ میں رکھتی ہے۔

اس لیے کہ یہاں انسان کی۔ پورے کے پورے انسان کی۔ تربیت ہوتی ہے اس کی عقل، اس کا دل، اسکی روح اور اس کا بدن، اس کے اخلاق اور برتاؤ سب کی تربیت مقصود ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ تربیت ہر انسان کو زندگی کے نرم گرم، خوشحالی و بدحالی، صلح و جنگ ہر طرح کے حالات کے لیے تیار کرتی ہے اور سوسائٹی کے خیر و شر اور تلخ و شیریں ہر قسم کے ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد کرتی ہے۔

اس کے لیے انسان کی مجاہدانہ تربیت بھی درکار ہے اور اجتماعی تربیت بھی مبادا مسلمان کسی اور وادی میں سانس لیتا رہے اور اس کے اردگرد کا معاشرہ کسی اور وادی میں بھٹکتا رہے۔

یہی جامعیت اور ہمہ گیریت ہے جس کی وجہ سے اسلام، عقائد، عبادات اور قانون کے میدان میں ممتاز و منفرد ہے اور اسی جامعیت کی وجہ سے تربیت کے میدان میں بھی اسے برتری حاصل ہے۔

ان سطروں میں ہم اختصار کے ساتھ ان تمام اساسی پہلوؤں پر گفتگو کریں گے جن کا اخوانی تربیت۔۔ یا دقیق لفظوں میں اسلامی تربیت، جس کی اخوانیوں نے سمجھا اور اختیار کیا نے اہتمام کیا۔

## فکری تربیت :

چونکہ اسلام نے اس پہلو پر نمایاں توجہ دی ہے اس لیے اخوان تربیت کے اس پہلو پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ پہلی آیت جو محمدؐ پر نازل ہوئی وہ اقرا باسم ربک والی آیت ہے جس میں اس پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو عقل کا احترام کرتا اور اسے ذمہ داریوں اور ثواب و عذاب کا محور تسلیم کرتا ہے۔ قرآن میں اس طرح کی آیات بے شمار ہیں جن میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

غور و فکر اسلام میں عبادت ہے اور کسی بات کو حق ماننے کے لیے دلائل کی طلب ضروری ہے اور اس کی نگاہ میں علم کا حاصل کرنا فرض ہے ٹھیک اسی طرح جمود ناپسندیدہ اور تقلید جرم ہے۔

اسلام ہر مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کی واضح تعلیمات پر ایمان رکھے اور اس کی دعوت "بصیرت پر مبنی ہو۔" تقلیدی ایمان کو وہ قبول نہیں کرتا اور اپنے ایمان لانے والوں کو اندھا بہرہ نہیں دیکھنا چاہتا جو دوسروں کے دماغ سے سوچیں اور بغیر غور و فکر کے ہر راہرو کے ساتھ چل پڑیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ خود سوچیں اور سمجھیں اور اللہ جسے خیر سے نوازنا چاہتا ہے اسے تفقہ عطا فرماتا ہے۔

اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ کہ عقلی و فکری تربیت، ایمانی یا روحانی تربیت کے

لیے لازم ہے اس لیے انسان کا ظاہری برتاؤ اس کے غور و فکر اور وجود حیات اور انسان کے بارے میں اس کے تصور کا ایک پرتو ہوتا ہے۔

اسی لیے امام شہیدؒ نے "فہم" کو بیعت کا سب سے پہلا رکن قرار دیا ہے اور اسے اخلاص عمل، جہاد، اخوت، اور دعوت اسلامی کے دوسرے تمام ارکان سے مقدم رکھا ہے اس لیے کہ ان سب سے پہلے فہم ضروری ہے اور آدمی حق کے لیے مخلص نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتا اور نہ اس کی راہ میں جہاد کر سکتا ہے اگر وہ دین حق کو نہیں پہچانتا ہے اور نہ اس کا فہم حاصل ہے۔

قرآن علم کو ایمان و اخبات سے پہلے رکھتا اور موخر الذکر دونوں چیزوں کو اول الذکر کا نتیجہ یا اسکی شاخ قرار دیتا ہے۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ (الحج: ۵۴)

"اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں۔"

تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے اخوان کے اساسی نظام میں یہ چیز موجود ہے کہ اولین مقصد علم کی توسیع و اشاعت ہے قرآن کریم کی ایسی ماہرانہ تشریح کرنا ہے جو اسے کھول کر رکھ دے اور اس کی فطری سادگی اور جامعیت واپس دلا سکے نیز اس کو اس انداز میں عوام کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے کہ دور جدید کی روح سے مطابقت ہو سکے اور شبہات و شکوک اور باطل عقائد کی بدلیاں چھٹ سکیں۔

دوسرا مقصد ان قرآنی اصولوں پر دلوں کو مطمئن کر کے اور ان کے اثرات ان زندگیوں میں داخل کر کے عمل کی تحریک و اصلاح ہے جس کے وسائل یہ ہیں کہ نشر و اشاعت کے راستوں اور مختلف ابلاغ کے طریقوں کو اختیار کر کے دعوت دی جائے، افراد اور کنبوں کے دلوں میں عملی

دینداری، قولی دینداری نہیں۔ کا مفہوم بٹھا کر ان اصولوں کی روشنی میں ان کی تربیت اور تزکیہ کا اہتمام کیا جائے اور ان کی صالح تعمیر و تشکیل کا انتظام کیا جائے اس طور سے کہ بدن کی ریاضت بھی ہو۔ عبادات کے ذریعہ روح کا ارتقا بھی ہو اور علم کے ذریعے عقل کو صیقل بھی کیا جائے۔

یہ اخوانی تربیت کی بنیاد ہے جس نے فکری یا ثقافتی تربیت کو اپنے تکمیلی طریقہ کار کے بالکل آغاز میں رکھا ہے۔

اخوانیوں کی تربیت ایک ایسی "مسلم عقل" کی تعمیر کی بنیاد پر قائم ہے جو دین اور دنیا کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔

اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان بھائی اتنی فکری و ثقافتی تربیت سے ضرور مالا مال ہو جس سے وہ اپنے عقیدہ کو سمجھ سکے، اپنی عبادات کی تصحیح کر سکے، اپنے سلوک اور برتاؤ کو منضبط کر سکے، اس کے ذریعہ اللہ کے قائم کردہ حلال و حرام میں تمیز کر سکے اوامر اور نواہی کو پہچان سکے اور اس کی روشنی میں واقعات و اشخاص اور ہر چیز کے موقف اور مختلف قسم کے مسائل میں اس مسلم عقل سے فیصلے کر سکے جو اسلامی زاویہ سے ہر چیز کو دیکھتی اور اسلامی کسوٹی سے فیصلہ کرتی ہے۔

اسی طرح سے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی کو سمجھ سکے کہ کس طرح چل رہی ہے؟ کیسے اس میں تبدیلی آتی ہے؟ اور کس طرح اپنا اثر ڈالتی ہے اور اس رفتار تبدیلی اور تاثیر کے عوامل کیا ہیں؟

لازم ہے کہ ہر مسلمان بھائی ابتدا میں اپنے اس چھوٹے سے معاشرے سے واقفیت حاصل کر کے، جس گاؤں یا شہر میں وہ رہتا بستا ہے پھر بتدریج اس سے بڑی سوسائٹی مثلاً سیاسی یا جغرافیائی لحاظ سے اپنے پورے ملک کے حالات سے آگاہ ہو پھر اس سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے پورے عالم اسلام کی کیفیات، تبدیلیوں اور اثرات سے مکمل واقفیت رکھے۔

عالم اسلام کے قلب میں کام کرنے والے مختلف نظریات، دشمن طاقتوں، یہودیت، صلیبیت اور اشتراکیت اور ان کے کارپردازوں، سیکولر جمہوریت کے علمبرداروں، لبرل

خیالات کے حاملین اور ان کے مقلدین کینہ پرور افراد اور مادہ پرست عناصر اور دوسرے دولت کے بندوں اور جاہ وحشم کے غلاموں کی ٹولیوں اور ان کی نقل وحرکت پر گہری نظر ہونی چاہیے۔

ان تمام معلومات کے اکٹھا کرنے اور ان میں اضافہ کرتے رہنے کا اخوان کی فکری تربیت نے پورا انتظام کر رکھا ہے اور ان تمام معلومات اور تربیت اسلامی کے میدان کی تمام خبروں کی مدد سے "کتیبہ" کا شعبہ تشکیل دیا ہے۔

اخوان المسلمون نے جس اسلام کو سمجھا ہے وہ قدیم بھی ہے اور جدید بھی!

جدید اس لیے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد حتیٰ کہ خود مسلمان بھی اس سے ناآشنا ہیں کیونکہ اخوان نے جس کو سمجھا ہے وہ دین ودنیا، عبادت وسیاست، روحانیت ومادیت، قمار و جہاد اور قرآن وتلوار کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ جیسا کہ تحریک کے بانی شہیدؒ نے بس اساسی اصولوں میں سے پہلے اصول کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

"اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ چنانچہ وہ حکومت وریاست کی باگ ڈور بھی سنبھالتا ہے اور تعمیر وطن اور تشکیل امت کے لیے جدوجہد کرتا ہے وہ اخلاق ورافت ورحمت کا مظاہرہ بھی کرتا ہے اور قوت اور قانون عدل کا تازیانہ بھی ہاتھ میں رکھتا ہے وہ علم وثقافت کے گیسو بھی سنوارتا ہے اور فصل وقضا کی کرسی پر بھی نظر آتا ہے۔ وہ حصول رزق اور کسب مال کی راہیں بھی نکالتا ہے اور دولت وثروت کے خزانے بھی فراہم کرتا ہے وہ ایک دعوت اور ایک نظریہ بھی ہے اور ایک جہاد اور لشکر بھی ہے۔"

دین کا یہ عیسائی مغربی تصور کہ وہ بندہ اور اس کے رب کے درمیان تعلق کا نام ہے اور اس کی جگہ مسجدوں خانقاہوں میں ہے جس کا حکومت اور معاشرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، اکثریت کے ذہنوں میں بیٹھ چکا ہے یہاں تک کہ اخوانیوں کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ انہوں نے

دین وسیاست کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔

اسلام کا یہ مفہوم لوگوں کے لیے بالکل نیا تھا حتیٰ کہ حسن البنا شہیدؒ نے اسے "اخوان کے اسلام" سے تعبیر کیا حالانکہ فی الواقع یہ تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود اسلام ہے اس لیے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے قرآن وسنت کے اسلام سے یہی سمجھا تھا۔

مسلمانوں کی اسلام کے اس مکمل تصور سے ناآشنائی کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔ آخری صدیوں کی مروجہ رسمیں اور اسلام میں داخل ہونے والی بدعتیں اور آمیزے اور غلط کاروں کی تحریف غلط پسند عناصر کی تلبیس اور جاہلوں کی من گھڑت تاویل کے نتیجہ میں اسلام کا غلط تصور اس کی بڑی وجہ ہے۔ اسی طرح اسلام کے جمالیاتی پہلو کو گدلا کرنے، اس کے باہمی ربط ونظام کو کھول دینے اور اس کے احکام وتعلیمات کے توازن واعتدال کو گڑبڑ کر دینے کی شعوری کوششیں ہوئیں۔ چنانچہ مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کر دیا گیا۔ جزئیات وفروعیات کو بنیادوں کی اہمیت دی گئی اور بنیادوں اور اساسی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

اسی ماحول میں اندھی تقلید اور مذہبی تعصب پروان چڑھا۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ نظریاتی جنگ یا ثقافتی استعمار کے حملوں کے اثرات ہیں جن سے مسلمان غیر ملکی قبضہ کے دور میں دوچار ہوئے۔ اس قابض سامراج نے مسلمانوں کی زندگی میں جدید افکار ونظریات اور نئی قدریں داخل کیں، جنھیں تعلیمی وتربیتی اداروں کے ذریعہ اور تہذیبی وثقافتی ذرائع کو اختیار کر کے نئی نسلوں کی رگوں میں دوڑایا گیا۔

سب سے خطرناک منصوبہ جس میں سامراج کامیاب ہو گیا یہ ہے کہ اس نے ایسے مسلمان سپوتوں کی پرورش کی جو اپنے کو "تہذیب وثقافت کا علمبردار" کہتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے پالا پوسا اور ان کی غذا کا بندوبست کیا، انہیں زندگی کے نئے فلسفوں کا دودھ پلایا۔ اپنے نقطہ نظر کا انہیں لقمہ دیا اور انکے قلب ودماغ کو اس نئی تہذیب پر فخر کرنا سکھایا، اس کی تنظیم

کے احترام اور اسکی تقلید سے محبت کا درس دیا لیکن ان کے اپنے دین، ان کی تہذیب اور ان کی وراثت کی اگر تعلیم دی تو وہ کمیت میں بہت کم، کیفیت میں بہت کمزور، قیمت میں بہت معمولی، مضامین میں باہم متضاد اور شکل وصورت مسخ شدہ تھی۔

اس لیے ہمیں اس پر تعجب نہیں ہے کہ آج مسلمان اپنے ہی وطن میں اجنبی بن کر رہ رہے ہیں، چہرے تو عرب مسلمانوں جیسے ہیں لیکن عقلیں امریکی یا یورپی چودھریوں کی مانند سوچتی ہیں۔

یہ اخوانی تربیت کی ذمہ داری تھی کہ قدیم جہالت کے آثار اور جدید جاہلیت کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتی اور ایک مسلم بھائی کو تہذیب یافتہ بنانے کے لیے مکمل طریقہ کار اپنانے کی جدوجہد کرتی اور اسے ایسی ثقافت کا دلدادہ بناتی جس کے عناصر اسلام کے چشمہ صافی سے ماخوذ ہوتے جس میں حذف واضافہ کی گندگی نہ متکلمین کی موشگافیاں نہ ہوں ارباب تصوف کے مکلفات اور فقہ وفتاوی کے اجارہ داروں کے اعتراضات سے خالی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اخوان نے قرآن کریم اور اس کی تفسیر کو ثقافت وعلم کا اولین ماخذ تسلیم کیا ہے اور اسلاف کی تفسیر کو دوسروں کی تفسیر پر مقدم رکھا ہے اسی وجہ سے تفسیر ابن کثیر کی ان کے دل میں بڑی عزت ہے اور وہ اسے قرآن کے تمام معاملات ومشکلات میں مرجع سمجھتے ہیں۔

سنت نبوی علم وثقافت کا دوسرا سرچشمہ ہے جس کی تشریح وتوثیق کے لیے ثقہ ائمہ حدیث کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

امام شہیدؒ "بیس بنیادی اصولوں" کے دوسرے اصول میں لکھتے ہیں۔

"اسلام کے احکام معلوم کرنے کے لیے ہر مسلمان کو بس قرآن کریم اور رسول خدا کی پاک سنت کا رخ کرنا ہوگا۔"

پھر قرآن فہمی کے سلسلے میں عربی زبان کے قواعد اور اس کے اصولوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ آیات کا مفہوم لینے میں کسی قسم کی موشگافی یا تاویل کی گنجائش نہ ہوگی نیز احادیث رسول کو سمجھنے کے لیے قابل اعتماد علمائے حدیث سے مدد لینی ہوگی۔"

یہی سبب ہے کہ اخوان نے علوم قرآن اور علوم حدیث کا اہتمام کیا اور حدیث کی بعض کتابوں پر خصوصی توجہ صرف کی، مثال کے طور پر امام نووی کی "ریاض الصالحین" ہے اسی طرح حدیث اور شریعت کو سمجھنے کا انتظام بھی کیا جس طرح سیرت نبویؐ کے مطالعہ، کو سمجھنے اور اسلام کے عملی نمونہ اور قرآن کی عملی تفسیر کی حیثیت سے اس سے عبرت و موعظت کے پہلو اخذ کرنے کا بندوبست کیا۔

اخوان نے تاریخ اسلامی اور اس کے رہنماؤں، علماء، اور مصلحین کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے میں غفلت یا سستی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

اخوان کے تربیتی طریقہ کار نے دشمن طاقتوں اور دینی فکری اور سیاسی دشمنوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ صہیونیت، اشتراکیت، استعماری طاقتیں، مشن عیسائیت، ماسونیت، بہائی اور قادیانی فرقے اور دوسری تمام غیر اسلامی طاقتوں کو اپنے مطالعہ اور پروگرام میں پیش نظر رکھا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخوان کی شاخیں اور ان کے مراکز علم و آگہی اور جمہوری اسلامی شعور کے گہوارے تھے اسی طرح ان کے کنبے فکری تربیت کے منظم حلقے تھے اور اس تربیت نے قوم کے سپوتوں میں اپنے ثمرات ظاہر کر دکھائے ان کی عقلیں اوہام و خرافات کی بیڑیوں سے آزاد ہو گئیں اور عظیم عالم اسلام کے مسائل کے سلسلے میں ان کی آنکھیں کھل گئیں وہ وطنیت کے تنگ داؤں سے نکل کر اسلامیت کے آفاقی میدان میں آ کھڑے ہوئے وسیع اسلامی ثقافت سے قریب ہوئے اور روشن دلائل اور کھلے دماغ کے ساتھ اس کے ماخذ سے استفادہ کیا۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ مصطفی کامل اور سعد زغلول کے دور حکومت میں مصری عوام کے اوپر عام طور پر جذباتی اور خطابی چھاپ کا غلبہ تھا جبکہ اخوان قومی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس وقت ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ دلوں کو جھنجھوڑا جائے ضمیروں کو دستک دی جائے، نظریہ اسلامی سے دشمنی کرنے والی فکری پارٹیوں۔ جیسے اشتراکیت وغیرہ کو کالعدم کر دیا جائے جماعت ایک طرف دعوت نظر و اشاعت میں مشغول ہو اور دوسری طرف اس کے عملی نفاذ

اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے اور پہلے ہی دن سے تمام باطل قوتوں اور ظلم و جہالت کی علمبردار طاقتوں سے برسرپیکار رہا جائے ان تمام ہی چیزوں کا فکری گہرائی کو کم کرنے میں اہم حصہ رہا ہے۔ اخوانی عوام کے نزدیک یہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی لیکن علمی و فکری طاقتوں کی پختگی چوتھی دہائی کے اواخر اور پانچویں دہائی کے آغاز تک موخر رہی جب تک کہ چھوٹا جوان ہو چکا تھا، بڑا بوڑھا ہو چکا تھا اور چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھر آئی تھیں۔

امام حسن البناء شہیدؒ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی کہ جماعت کے افراد کے اندر فکری و علمی گہرائی پیدا کی جائے اور دوسری طرف دیگر افراد کے سامنے اسلام کے تمام پہلوؤں کی وضاحت اور اس کے مقاصد کی تشریح کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ماہنامہ "الشہاب" جاری کیا تاکہ یہ خلا پر کیا جا سکے اور یہ ذمہ داری ادا ہو سکے اور مجلہ "المنار" کی جگہ لے سکے جو اپنے بانی علامہ سید رشید رضا مصری کی وفات کے بعد بند ہو گیا تھا لیکن یہ نوزائیدہ رسالہ پانچ شماروں سے زیادہ نہ نکل سکا۔ حسن البنا شہید اس کے تمام مواد خود ہی لکھتے اور ترتیب دیتے تھے۔ پھر دسمبر ۱۹۴۸ء میں وارد گیر کا مرحلہ شروع ہوا اور فروری ۱۹۴۹ء میں صاحب "الشہاب" قتل کر دیئے گئے۔

## اخلاقی تربیت :

اخوان کے نزدیک تربیت کا ایک پہلو نفس یا اخلاق کا تزکیہ ہے۔ انہوں نے اس کا شدت سے اہتمام کیا۔ اور پوری ذمہ داری سے اس کی طرف توجہ کی اور اسے اجتماعی انقلاب کا اولین محور قرار دیا۔ امام حسن البناؒ اخلاق کو "انقلاب کا دستہ" کہتے تھے وہ دستہ جو ٹرام گاڑی کو ایک راستے سے دوسرے راستے کی طرف اور ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف موڑ دیتا ہے وہ اس سلسلہ میں شاعر کا یہ شعر بھی دوہرایا کرتے تھے۔

لمعرک ما ضاقت بلاد باھلھا
ولکن اخلاق الرجال تضیق

(تمہاری زیست کی قسم، زمین اہل زمین پر کبھی تنگ نہیں ہوئی بلکہ لوگوں کے اخلاق تنگ ہوئے ہیں۔)

ان کا ایمان تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ "دنیا کا اصل بحران سیاست اور معیشت سے پہلے دل اور ضمیر کا بحران ہے۔"

"ہم کہاں سے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔" اس عنوان کے تحت حسن البناؒ اپنے رسالہ "ہماری دعوت کس چیز کی طرف ہو؟" میں لکھتے ہیں۔

"جو امت تعمیر ملت لیے کوشاں ہو، قوموں کی تربیت جس کا نصب العین ہو، اصولوں کی حمایت جس کا مقصد زیست ہو اور جو اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتی ہو یا کم از کم جو جماعت ان چیزوں کی داعی ہو اس کے لیے زبردست باطنی قوت کی ضرورت ہے ضروری ہے کہ اسکے اندر ایسی محکم اور ٹھوس وفاداری ہو جو تلون سے مامون اور بے وفائی سے کوسوں دور ہو، جو حرص سے بے گانہ اور بخل سے بیزار ہو جسے عزیز سے عزیز پونجی بھی قربان کر دینے میں کوئی تامل نہ ہو۔ اسے اپنے اصولوں کی ایسی جانکاری، ان پر ایسا ایمان اور ان کی قدر و قیمت کا ایسا شعور ہو کہ ان کے سلسلہ میں کبھی اس سے بھول نہ ہو، ان سے وہ کبھی منحرف نہ ہو، نہ ان کے معاملے میں وہ کسی سودے بازی کی روادار ہو۔ یہی وہ زبردست روحانی قوت اور یہی وہ اولین بنیادیں ہیں جن پر اصولوں کی تعمیر اور ابھرنے والی قوموں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان ہی سے جوان اور طاقتور امتیں وجود میں آتی ہیں، جو قوموں میں ایک طویل مدت سے چراغ کشتہ کی مانند بجھی پڑی ہوں جن کے اندر زندگی کے چشمے خشک ہو گئے ہوں، وہ پھر سے فروغ پاتی اور نئی زندگی کی توانائیوں سے مالا مال ہوتی ہیں لیکن اگر کوئی گروہ ان چاروں صفات سے خالی ہو یا کم از کم اس کے رہنما اور مصلحین

ان سے عاری ہوں تو وہ ایک اپاہج اور نکما گروہ ہے جو کبھی کسی خیر سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ نہ کسی مقصد میں کامیاب ہوسکتا ہے اس کی قسمت تو یہی ہے کہ وہ خواب وخیال اور ظنون واوہام کی دنیا میں پڑا رہے کہ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِی مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا اپنی مخلوق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے اور یقین مانو اللہ کی سنت کبھی بدلا نہیں کرتی۔

إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الرعد: ۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔''

ایک قانون ہے جس کی وضاحت ایک حدیث صحیح سے ہوتی ہے آپؐ نے فرمایا:

يُوشِكُ الأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عليكم الامم ما تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا وَلَيَنْزَعَنَّ اللهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ اللهُ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهَنَ

''عنقریب قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے جیسے کھانے والے اپنے پیالوں پر ٹوٹ پڑیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا اور دلوں پر وہن ڈال دے گا۔''

کسی نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! کیا اس دن ہم تھوڑے ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا:

بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ، وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ

''نہیں اس دن تم بہت ہو گے۔ لیکن ایسے ہی ہو گے جیسے سیلاب کی جھاگ۔''

ایک شخص نے عرض کیا: اور وہن کیا ہے اے اللہ کے رسولؐ۔۔۔

آپؐ نے فرمایا:

حُبُّ الدُّنْیَا وَ کَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ

"دنیا کی محبت اور موت سے وحشت"

دیکھتے ہی نبیؐ نے کتنی وضاحت سے فرمایا ہے کہ امتوں کی کمزوری اور قوموں کی زبوں حالی کا اصل راز دلوں کی کمزوری، باطن کی ویرانی، اخلاق کی پستی اور ہمت و مردانگی سے محرومی ہے۔ اگر کوئی قوم آفتوں کا شکار ہے تو خواہ اس کی تعداد کتنی ہی ہو، اور چاہے مال و ثروت کی کتنی ہی فراوانی ہو وہ کبھی پنپ نہیں سکتی۔"

اخوان المسلمون کے دوسرے مرشد حسن الہضیبی رحمہ اللہ نے اس پہلو پر بانی تحریک سے کم توجہ نہیں دی۔ اس سلسلے میں ان کے چند جملے مشہور اور زبان زد ہیں مثال کے طور پر۔

"اپنے دلوں سے انگریزوں کا رعب نکال دو، وہ تمہارا ملک خالی کر دیں گے۔"

یا ان کا یہ قول کہ:

"اپنے دلوں میں اسلامی حکومت قائم کر لو، تمہاری سرزمین پر بھی قائم ہو جائے گی۔"

مرشدِ ثانی کی منشاء انگریزوں کو بھگانے اور اسلامی حکومت کو قائم کرنے کے لیے جس جدوجہد اور سیاسی و فوجی جنگ کی ضرورت ہے، اس سے انکار نہیں ہے۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ انہوں نے اپنے سپوتوں اور دعوت اسلامی کی فوجوں کو جہاد کے لیے اور نہر سویز اور قنال الکبیر کے محاذوں پر شہادت سے ہمکنار ہونے کے لیے حوالہ کر دیا؟

ان جملوں سے ان کی مراد یہ ہے کہ ہر کامیاب جنگ کے لیے نفسیاتی آمادگی، شعوری تیاری اور اخلاقی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جو افراد کی زندگیاں بدل دیتی ہے جس کے نتیجے میں پوری سوسائٹی میں انقلاب آجاتا ہے جیسا کہ قرآن نے اس کی وضاحت کر دی ہے جہاں اس نے تبدیلی و انقلاب کی اجتماعی سنت بیان کی:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اسلام اخلاق فاضلہ کو ایمان کا شعبہ یا اس کا لازمی ثمرہ قرار دیتا ہے۔

جس طرح ایمان عقیدے کی سلامتی اور عبادت کے اخلاص کی نمائندگی کرتا ہے اسی طرح اخلاق کی بہتری کی بھی نمائندگی کرتا ہے حدیث میں ہے۔

أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا

"مکمل مومن وہ ہے جو بہترین اخلاق کا حامل ہو۔"

اخلاق کا مفہوم اور دائرہ بہت وسیع ہے حتی کہ رسول اکرمؐ کی رسالت اور آپ کا پورا پیغام اس کے اندر محصور ہو جاتا ہے۔

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

"میری بعثت صرف اس لیے ہوئی ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔"

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (قلم:۴)

"اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔"

حضرت عائشہؓ سے حضور اکرمؐ کے اخلاق کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ "آپ کا اخلاق قرآن تھا۔" یعنی قرآن میں جن فضائل کا تذکرہ ہے، جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور جن نیک اعمال پر ابھارا گیا ہے ان سب کا مجموعہ آپؐ کی ذات گرامی تھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق کی بابت دریافت کیا یا تو انہوں نے کہا کہ "آپ کا اخلاق قرآن تھا۔" یعنی قرآن میں جن فضائل کا تذکرہ ہے، جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور جن نیک اعمال پر ابھارا گیا ہے ان سب کا مجموعہ آپ کی ذات گرامی تھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق مجرد نرمی اور حسن اخلاق کا نام نہیں ہے جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں اگرچہ یہ ایک مسلم کے اخلاق کا ایک اہم رکن ہے۔

وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (حدیث)

"اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔"

اَنَّ اَحَبَّکُمْ اِلَیَّ وَ اَقْرَبَکُمْ مِنِّی مَجْلِساً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَحَاسِنَکُمْ اَخْلَاقاً اَلْمُوَطِّؤُنَ اَکْنَافاً اَلَّذِیْنَ یَاْلَفُوْنَ وَیُوْلَفُوْنَ (حدیث)

"روز قیامت میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ قریب وہ افراد ہوں گے جو اپنے اخلاق میں تم سب سے اچھے ہوں گے، جو اپنے کندھوں کو پست رکھنے والے ہوں گے جو لوگوں سے محبت کرتے ہوں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہوں گے"۔

برائی عورتوں سے دوری اور شراب سے نفرت کرنے تک بھی اخلاق محدود نہیں ہو سکتا جیسا کہ دوسرے لوگ سمجھنا چاہتے ہیں مگر چہ رسول کریمؐ یہ صفات لوگوں میں بدرجہ اتم دیکھنا چاہتے تھے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ (النور۔ ۳۰)

"اے نبیؐ مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔"

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ (المائدہ ۹۰)

"یہ شراب اور جوا، اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو۔"

اخلاق کا دائرہ انہیں صفات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے وسیع تر زندگی کے دوسرے گوشوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ضبط نفس کی طاقت ہو بات میں سچائی اور خلوص ہو۔ کام میں محنت اور بہتری ہو، معاملات میں امانت داری پائی جاتی ہو، رائے کے اظہار میں بہادری اور بے باکی ہو،

فیصلوں میں انصاف اور عدل ہو، حق پر جمنے اور خیر پر قائم ودائم رہنے کا جذبہ ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جرات وہمت ہو، صفائی و پاکیزگی سے لگاؤ اور نظام کا احترام پایا جاتا ہو اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہم دگر تعاون کی روح کارفرما ہو ان سب صفات کا مجموعہ اخلاق کہلاتا ہے۔

۱۔ صبر :

اخوان المسلمون نے افراد کے دلوں میں جس اخلاقی فضیلت کی تخم ریزی کرنے پر اولین توجہ صرف کی وہ صبر ہے۔

راستہ چاہے لمبا اور کانٹوں سے بھرا ہوا ہو، ڈرا دھمکا کر لوٹنے والوں کی کثرت ہو یا حرص وطمع کے راستے سے آنے والی رکاوٹیں ہوں ان تمام صورتوں میں صبر ہی کی روش اپنانی چاہیے۔ عوام الناس کے برتاؤ کا خیال نہیں کرنا ہے ان کے مذاق واستہزا کو خاطر میں نہیں لانا ہے ان کی طرف سے آنے والی تکالیف اور مظالم سے گھبرانا نہیں ہے۔ خاص طور سے جہاد کے میدان میں صبر ہتھیار ہے۔ آزمائشوں کے وقت کام آنے والا ذخیرہ ہے اور حق کی راہ میں پیش آمدہ مصائب پر مدد کرنا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں حق اور صبر کی تلقین کو جمع کر دیا ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر:۳)

"اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

اللہ تعالیٰ نے لقمانؑ کی زبان سے فرمایا جب کہ وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے۔

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (لقمان:۱۷)

"اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو، نیکی کا حکم دو، بدی سے منع کرو اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کرو، یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔"

اسی وجہ سے ظالموں کے ظلم کے شکار بندوں کو یہ دعا سکھائی گئی :

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (الاعراف:۱۲۶)

"اے ہمارے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔"

میدان جنگ کے غازیوں کو یہ دعا سکھائی گئی :

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ:۲۵۰)

"اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جمادے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔"

## ثابت قدمی :

صبر سے متعلق اور اس کی تکمیل تک پہنچانے والی چیز ثابت قدمی ہے۔ امام شہیدؒ نے اسے بیعت کے دس ارکان میں شامل کیا ہے اور اس کی یوں تفسیر کی ہے۔

"ثابت قدمی سے مراد یہ ہے کہ ہمارا بھائی برابر متحرک اور سرگرم رہے، اپنے مقصد کی راہ میں دیوانہ وار آگے بڑھتا رہے، انتظام کی گھڑیاں خواہ کتنی ہی دراز ہو جائیں اور چاہے کتنے ہی ماہ و سال بیت جائیں، وہ ہمت نہ ہارے، وہ برابر جدوجہد کرتا رہے یہاں تک کہ اسی راہ میں جان دے دے کہ جب اپنے رب سے ملے تو اس کا دامن خالی نہ ہو، وہ کامرانیوں میں سے کسی ایک سے مالا مال ہو چکا ہو وہ لیلائے مقصود سے ہمکنار ہو چکا ہو یا شہادت کی خلعت زریں سے اس کا ستارہ قسمت چمک اٹھا ہو"

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (الاحزاب:۲۳)

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اللہ سے کئے

ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔"

یاد رہے ہمارے نزدیک تدریج کا ایک جز وقت یا موسم کی سازگاری بھی ہے بلاشبہ راستہ بھی بہت دشوار اور صبر آزما ہے بیچ میں دور دور تک سایہ بھی نہیں، پھر درمیان میں جگہ جگہ کھائیاں اور کھاریاں بھی ہیں لیکن کیا کیجئے کہ تنہا یہی دوراہ ہے جو ہمیں کعبہ مقصود تک پہنچا سکتی ہے اور اسی کی لکیروں پر چل کر ہم اجر سے اپنے جیب و دامن بھر سکتے ہیں، ایسے اجر سے جو انتہائی دل آویز بھی ہو اور بے حد و حساب بھی۔"

مختلف دعوتوں اور تحریکوں سے وابستہ افراد کے لیے ایک بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ ان کا دل اس راہ پر چلنے میں تنگی محسوس کرتا ہے اور اسے اطمینان اور شرح صدر حاصل نہیں ہوتا چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سفر دشوار ہے، مسافت طویل ہے اور راہ روی مشکل ہے تو بیچ چھوڑ بیٹھتے ہیں، بیچ راستے اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتے ہے یا تھک ہار کر واپس لوٹ جاتے ہیں یا دائیں بائیں بھٹکنے لگتے ہیں۔

اسی لیے اخلاق کی ضروری صفت ثابت قدمی کو سمجھا گیا ہے جو اس طرح کے افراد اور اس راہ پر چلنے والوں کے لیے بنیادی وصف کی اہمیت رکھتی ہے تاکہ منزل مقصود کی طرف سفر جاری رہے درمیان میں رکنے یا سستانے کی غلطی کا ارتکاب نہ ہو یا اس راہ سے پھر جانے کا گناہ سرزد نہ ہو۔

ثابت قدمی کی یہ صفت اس لیے بھی ضروری ہے کہ نفس عجلت پسند واقع ہوا ہے، جلد ملنے والی اور سہل الحصول چیزوں کو پسند کرتا ہے اور انسان بھی جلد باز پیدا کیا گیا ہے اسی لیے اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت فرمائی:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ
(الاحقاف 35)

''پس اے نبی، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو''

کچھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو ہوا کے رخ پر بہتے اور رنگ میں رنگ جاتے ہیں جب تک ہوا سازگار ہوتی ہے مطلع صاف ہوتا ہے اور فضا موافق ہوتی ہے یہ بڑے طنطنے اور کروفر کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں لیکن جوں ہی فضا غبار آلود ہوئی، آسمان میں بدلیاں نظر آئیں اور تیز ہوا کے آثار معلوم ہوئے۔ ان کے ارادوں میں تزلزل اور بے یقینی پیدا ہونے لگتی ہے اور ان کا سفر ختم ہو جاتا ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَ لَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (العنکبوت 10)

''لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو یہی شخص کہے گا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے''

اور ایک دوسری جگہ ایسے افراد کی حالت یوں بیان کی گئی ہے:

وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ (الحج 11)

اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو الٹا پھر گیا اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔

یہی حال ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو ایک کنارے ہو کر اللہ کی عبادت کے ڈھونگ رچاتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مصیبتوں کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہیں اور سخت حالات میں ثابت قدم رہتے ہیں لیکن دنیا اپنی زیب و زینت کے ساتھ بن سنور کر سامنے آتی ہے تو ان کے قدم

پھسل جاتے ہیں ان کے سامنے مال کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے یا مناصب اور گدیوں کی لالچ دی جاتی ہے تو ان کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔ ان کے دماغی وفکری توازن رخصت ہونے لگتا ہے اور اپنی دعوت وتحریک کو بھول بیٹھتے ہیں۔

دعوت اور تحریک کے ہر کارکن کو اپنے سامنے حضور اکرم کا مبارک نمونہ سامنے رکھنا ہے۔ جب مشرکین مکہ نے آپؐ کے مال ودولت کے انبار لگانے اور جاہ وحشم کی اونچی سے اونچی منزلت اس شرط پر پیش کرنے کا وعدہ کیا کہ آپ اپنی دعوت سے باز آجائیں تو آپؐ نے یہ تاریخی جواب دیا۔ "بخدا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں اس امید میں کہ میں یہ کام ترک کردوں تو ایسا نہیں ہوسکتا تا آنکہ کہ اللہ اسے غالب کردے یا میری موت آجائے۔"

۳۔ امید:

یعنی غلبہ اسلام کی امید اور اس امید پر یقین کہ مستقبل اس کا ہوگا اللہ کی مدد قریب ہے گرچہ حالات کتنے ہی تاریک ہوجائیں اور مصائب کتنے ہی بڑھ جائیں لیکن انجام کار اس کے حق میں ہوگا۔

امام شہیدؒ اس صفت پر بہت زور دیتے اور مختلف اسالیب کے ذریعہ اسے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کرتے تھے، مغربی استعمار اور عوامی جہالت نے جو قاتلانہ مایوسی اور ہلاکت خیز ناامیدی پھیلا رکھی تھی اس کے خلاف انہوں نے جنگ لڑی اور لوگوں کو یاد دلایا کہ مایوسی کفر ہے اور ناامیدی گمراہی کے مظاہر میں سے ہے کیونکہ:

إِنَّهُ لَا يَيْئَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (یوسف:۸۷)

"اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"

وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ (الحجر:۵۶)

"اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔"

امام شہید کا یہ جملہ تو مشہور ہو چکا ہے "کل جو خواب تھے آج وہ حقیقت ہو گئے اور آج جو خواب معلوم ہوتے ہیں کل وہی حقائق ہوں گے۔"

امام شہید تحریک اخوان کے مقاصد اور مصر، عالم عرب اور عالم اسلام کو آزاد کرانے کی عظیم تمنائیں یاد دلاتے تھے۔ انھیں خلافت اسلامیہ کے پرچم تلے متحد کرنے اور پوری دنیا کی ہدایت وقیادت کی تکمیل اپنے ہاتھوں میں لینے کی امیدیں دلاتے تھے لیکن اس راہ میں جو پر خطر گھاٹیاں اور...... مشکلات و مصائب کے دریا اور پہاڑ ہیں ان کا تذکرہ کرنا نہ بھولتے تھے۔

لیکن ان گھاٹیوں کے بعد کامیابی کے عوامل کا تذکرہ ضرور کرتے تھے کہتے ہیں :

"ان سب گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے یہ کبھی نہ بھولو کہ ہم اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں جو سب سے زیادہ پاکیزہ اور بلند دعوت ہے۔ ہم فکر اسلامی کی منادی کرتے ہیں جس سے زیادہ ٹھوس فکر اور کوئی نہیں اور ہم شریعت قرآن کے علمبردار ہیں جس سے بڑھ کر عادلانہ نظام اور متوازی شریعت زمین وآسمان میں کہیں نہیں۔

آج ساری دنیا اس دعوت کی پیاسی ہے آج سارا عالم اسلام اس کے لیے بے قرار اور سراپا انتظار ہے آج راستہ ہموار اور فضا اس کے لیے سازگار ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہم شخصی اغراض سے پاک اور ذاتی مفادات سے بے نیاز ہیں، ہم صرف رضائے الٰہی کے طالب اور فلاح امت کے خواستگار ہیں۔ ہماری ساری جانفشانیاں صرف خدا کے لیے ہیں، ہمیں اسی سے امید ہے اور اسی کی نصرت کے ہم منتظر ہیں اور جس کی مدد اللہ کرے اس سے بھلا کون جیتے؟

تو ہماری دعوت کی مضبوطی، پاکیزگی دنیا کی تشنگی اور خدا کی دستگیری یہ وہ عوامل ہیں جن کے بعد کامیابی یقینی ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی چیز سد راہ نہیں بن سکتی :

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف ۲۱)

"اور اللہ تو اپنا کام کر کے رہتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

امام حسن البناؒ اپنے ایک رسالہ میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے دعوت کے انفرادی، اجتماعی، مقامی و بین الاقوامی مقاصد بیان کرتے ہیں پھر کہتے ہیں :

"اے نوجوان بھائیو! تم اپنے سے پہلے ان لوگوں سے کمزور نہیں ہو جن کے ہاتھوں اللہ نے اس پیغام کو غالب کیا تھا۔ پس کمزوری نہ دکھاؤ، سست نہ پڑو اور اللہ کے اس قول کو اپنا نصب العین بنالو :

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (العمران:۱۷۳)

"جن لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔"

ہم اپنے آپ کی تربیت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے اندر سے ایک مسلم شخصیت جاگ اٹھے اور اپنے گھرانوں اور کنبوں کی تربیت اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ ان سے مسلم گھرانہ تشکیل پا سکے، قوم کی تربیت اس لیے مقصود ہے کہ اس سے ایک مسلم قوم کی تعمیر ہو سکے اور اسی قوم کے درمیان سے اسلامی حکومت نمودار ہوگی۔

ہم متعین خطوط کے ذریعہ اپنی غایت تک پہنچیں گے اور جو منزل ہم نے اپنے لیے متعین کی ہے اس تک پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ کیونکہ اللہ کی مشیت اور اس کی مدد ہمارے ساتھ ہو گی۔

وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (التوبہ:۳۲)

"اور اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اے بھائیو! اس کے لیے ہم نے غیر متزلزل ایمان، مسلسل حرکت میں رہنے والا عمل،

اللہ پر غیر معمولی اعتماد اور شوق شہادت سے لبریز روحوں کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔"

جب بھی یاس و قنوط کی بدلیاں چھاتیں، امام شہیدؒ اسی طرح روحوں اور ضمیروں پہ دستک دے کر ان کا عزم و ارادہ مضبوط کرتے۔ ان کے اندر امید و آرزو کے چراغ روشن کرتے، اعتماد و توکل کی تخم ریزی کرتے اور غلبہ اسلام کی توقعات اجاگر کرتے۔

امام شہیدؒ اپنی ایک گفتگو میں غلبہ اسلام کی حتمیت کے چار دلائل دیتے ہیں :

۱۔ آیات و احادیث سے استشہاد کرتے ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث سے غلبہ حق کی جو آیات اور ارشادات موجود ہیں ان کو سامنے لاتے ہیں اور خدائے بزرگ و برتر سے زیادہ مستقبل کے حالات سے واقف اور کون ہوگا؟

۲۔ عقلی دلائل کا سہارا لیتے ہیں پوری دنیا مادیت سے اکتا کر روحانیت کی تلاش میں ہے اس کے مسائل حل ہونے کے بجائے الجھتے جا رہے ہیں اگر اس دین کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے جو روحانیت اور مادیت کا حسین توازن پیش کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے ٹھکرا دے۔

۳۔ تاریخی دلیل۔ تمام ہی مصیبتوں، خطرات اور ہولناک جنگوں کے باوجود اس دین کی قوت و طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی اور اسے صلیبیوں اور تاتاریوں میں سے کوئی بھی مٹا نہ سکا بلکہ تاتاری جو اسلام کو فتح کرنے اٹھے تھے خود اس کے مفتوح ہو گئے۔

۴۔ حسابی دلیل۔ ابتداء میں قیادت عالم کی باگ ڈور فراعنہ، ہندوؤں، چینیوں، ایرانیوں جیسی مشرقی اقوام کے ہاتھوں میں تھی پھر یونان و روم کے راستے سے قیادت کی نکیل مغرب کے ہاتھ میں چلی گئی پھر اسلامی تہذیب کے راستے سے مشرق اس پر قابض ہو گیا اور آج مغرب عالم انسانیت کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اب ہم پھر انتظار کر رہے ہیں کہ ایک بار پھر رہنمائی و قیادت کا یہ فریضہ مشرق کے ہاتھوں میں منتقل ہو۔ جب کہ روحانی اور معنوی حیثیت سے مغرب بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے اور نفس و ضمیر کی جنگ، گھر

کی کشمکش، سوسائٹی کی خانہ جنگی اور امن وشانتی کے خلاف لڑائیوں نے اسے تباہ و برباد کر دیا ہے۔

۵۔ بذل۔ یہ نمایاں ترین وصف ہے جس کی بنیاد پر اخوان کی تربیت ہوتی ہے۔ اسے سخاوت اور قربانی کا نام دیا جا سکتا ہے اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ کوئی بھائی اپنی دعوت کی راہ میں جدوجہد کرنے اور مال و دولت خرچ کرنے اور وقت لگانے میں بخل سے کام نہ لے، اس کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و توضیح سے جی نہ چرائے اس کی تقویت اور تعاون سے ہاتھ نہ کھینچے اور دوسرے بندگان خدا کی جان و مال اور دولت و ثروت کے ذریعہ مدد کرنے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔ ہر بھائی یہ اپنا شعار بنالے کہ "خرچ کرو تا کہ دوسرے فائدہ اٹھا سکیں، بیچ ڈالو تا کہ دوسرے اس کا مزہ چکھ سکیں، دوڑ دھوپ کرو تا کہ دوسروں کے لیے آرام ملے۔"

اخوان کی اکثریت گرچہ خستہ حال اور مفلوک الحال ہے لیکن اس بہترین صفت کے بل پر ان کے اندر یہ طاقت پیدا ہو گئی کہ انہوں نے دعوت دین کے تمام مصارف برداشت کئے اس کے تمام پروگراموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہر قسم کی مدد کی

یہاں تک کہ ان میں ایک بھائی ایسے بھی تھے جنہوں نے اخوان کے مرکز اور مسجد کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے اپنی سائیکل بیچ دیا اور دار الاخوان تک ۶ کلومیٹر پیدل سفر طے کرنے پر تیار ہو گئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا جب شبینہ اجتماع میں مقررہ وقت سے نصف گھنٹہ دیر سے پہنچنے لگے تو امام شہیدؒ نے اس مسلسل تاخیر کا جواز نہیں بن سکتے تھے۔ چھان کرید کے بعد معلوم ہوا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے تعمیر فنڈ میں ڈیڑھ سو قرش دینے کا وعدہ کر لیا لیکن اتنی رقم ان کے پاس نہ تھی مجبوراً سائیکل فروخت کرنا پڑی۔ چنانچہ اخوان کے دلوں پر اپنے بھائی کے اس اقدام کا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے ایک نئی سائیکل خریدنے کے لیے چندہ جمع کیا اور یہ نئی سائیکل انہیں ان کی مخلصانہ قربانی اور پاکیزہ جذبہ کی قدردانی کے طور پر ہدیۃً پیش کر

دی گئی۔ ان بھائی کا نام علی ابو العلا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ "حسن البنا شہیدؒ کی ڈائری" میں موجود ہے۔

## جسمانی تربیت :

اخوان نے اپنی تربیت میں جسمانی و بدنی پہلو کو کبھی نظر انداز نہ کیا اس لیے کہ بدن ہی مقصد تک پہنچانے والی سواری ہے اور دینی و دنیوی ذمہ داریوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے اسی لیے حدیث میں آیا ہے۔

إِنَّ لِبَدَنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا

"تمہارے بدن کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔"

۱۔ جسم کی تندرستی اور تمام بیماریوں سے اس کی حفاظت کیونکہ اس صحت کا اثر دل و دماغ اور نفس و عقل بھی قبول کرتی ہے پرانا قول ہے "عقل سلیم، جسم سلیم میں ہوتی ہے۔" اسی طرح کمزور جسم کا مالک اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر سکتا، اس لیے صفائی ستھرائی اور حفاظت و علاج ضروری ہے اور مضر صحت عادات مثلاً دیر تک جاگنا، سگریٹ پینا وغیرہ سے بچنا لازم ہے۔ ہمارے ہر کارکن بھائی کا فرض ہے کہ وہ چائے اور قہوہ کا استعمال کم کرے اور تمباکو نوشی اور سگریٹ نوشی سے یک لخت رک جائے۔

۲۔ جسم کی قوت و طاقت اس لیے کہ محض بیماریوں سے بچنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جسم کا طاقتور ہونا، مشقتوں کا عادی ہونا اور آسانی و تیزی کے ساتھ حرکت و عمل پر قادر ہونا بھی ضروری ہے حدیث میں آتا ہے کہ قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔ اس ورزشی مشقتوں، ریاضتی مقابلوں، کھیل کود، دوڑ تیراکی و تیر اندازی کے لیے کلبوں کا اہتمام کیا گیا۔ حدیث شریف میں ہے:

عَلِّمُوْا اَبْنَاءَكُمُ السِّبَاحَةَ وَالرِّمَايَةَ وَرُكُوْبَ الْخَيْلِ

"اپنے بیٹوں کو تیر اندازی، تیراکی، اور شہسواری کے فن سکھاؤ۔"

۳۔ قوت برداشت کی صفت پیدا کرنا، صرف جسم کی صحت اور اس کی قوت و طاقت کافی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ سختی سے مانوس نہ ہو، مشقتوں کے برداشت کرنے، مصائب کے جھیلنے کی عادت نہ ہو، سرد و گرم، جلال و جمال، تلخ و شیریں ہر قسم کے حالات کے مقابلے کی سکت نہ ہو۔ مشہور جملہ ہے کہ "محنت کی زندگی بسر کرو کیونکہ نعمت لازوال نہیں ہے۔"

ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے اخوان نے ورزشی کھیلوں، اسکاؤٹنگ، پکنک اور فوجی و گشتی سپہ گری کی ٹیمیں تیار کیں تاکہ سخت و محنت کی زندگی گزارنے کی تربیت ہو۔ مکارہ و شدائد پر صبر کرنے، صحراؤں اور پہاڑوں میں دوڑ بھاگ کرنے کی ٹریننگ ہو۔ چلچلاتی دھوپ، کڑاکے کی سردی یا زوردار بارش میں کام کرنے کا تجربہ ہو سکے، بھوک و پیاس برداشت کرنے کی طاقت پیدا ہو، خراب یا ردی کھانوں پر بھی گزارہ کیا جا سکے، یہی نہیں بلکہ تربیت حاصل کرنے والے یہ بھائی سبزی اور دال میں کنکریاں اور ریت کی مٹھیاں ڈال کر ہضم کر لینے کی تربیت بھی حاصل کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ ہر نازک صورت حال کا پامردی سے مقابلہ کر سکیں۔

بلاشبہ اس تربیت، جس میں بعض اوقات بڑی سختی محسوس ہوتی ہے۔ کے میدان میں جہاد نمایاں نتائج اور فوری ثمرات برآمد ہوتے ہیں جب جنگ کا سائرن بجتا ہے اور میدان جہاد میں میں نکلنے کی دعوت دی جاتی ہے تو خوشحال اور فارغ البال لوگ کرتے ہیں جو اس طرح کے صبر آزما حالات اور مراحل سے گزر چکے ہوتے ہیں۔

جیلوں اور قید خانوں میں بھی یہ تربیت اپنا کام کر دکھاتی ہے جہاں کا کھانا اور پانی بھی ایک قسم کی سزا تصور کی جاتی ہے۔ کچی زمینوں اور لکڑی کے تختوں پر جہاں ننگی پیٹھ سونا پڑتا ہے وہاں سیاہ ہی سفید مانا جاتا اور ایذا و تکلیف دہی کو قانون سمجھا جاتا ہے۔

## مجاہدانہ تربیت :

تربیت اخوان کو ممتاز و منفرد کرنے والا پہلو جہاد کا ہے یعنی مجاہدانہ تربیت میں نے فوجی

وعسکری تربیت کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا ہے کیونکہ عسکریت میں تو صرف ٹریننگ اور نظم و ضبط کی صفات پائی جاتی ہیں جبکہ مجاہدانہ تربیت میں ایمان کی گرمی ہے تو اخلاق کی حرارت بھی، روح کی غذا کا سامان ہے تو بذل و انفاق کے جذبات و احساسات بھی اور ٹریننگ اور نظم وضبط کا مفہوم بھی اس لیے جہاد کا لفظ عسکریت کے مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع وعمیق اور جامع وہمہ گیر ہے۔

اخوان کے اس تصور سے پہلے جہاد کا مفہوم اسلامی تربیت، اور اسلامی زندگی سے خارج ہو کر رہ گیا تھا۔ متصوفانہ جماعتیں اور دیگر دینی انجمنیں اسے لائق التفات نہیں سمجھتی تھیں، وطن پرست پارٹیاں صرف سیاسی جنگ کا اہتمام کرتی تھیں اور مسجدوں کے واعظ اور امام جہاد کو دینی فرائض سے باہر سمجھتے تھے۔

جب تحریک اخوان المسلمون وجود میں آئی تو اس نے جہاد کے تن مردہ میں نئی روح پھونکی اور اسے عوام کے سامنے از سر نو اجاگر کیا اپنے رسائل، کتابوں، اور اخبارات میں اس کو شایان شان مقام دیا۔ لیکچروں، اجلاسوں، ترانوں اور نظموں میں اس کی اہمیت وضرورت پر زور دیا اور اس کی فضیلتیں انفرادی واجتماعی زندگی میں اس کے ثمرات ونتائج کو واشگاف کیا۔ امام حسن البنا نے اسے بیعت کے دس ارکان کا ایک رکن قرار دیا اور تحریک کا ایک سلوگن یہ بھی بتایا۔

اَلْجِهَادُ سَبِيْلُنَا

"جہاد ہمارا راستہ ہے۔"

وَالْمَوْتُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَسْمٰى اَمَانِيْنَا

"اللہ کی راہ میں موت ہماری سب سے بڑی آرزو ہے۔"

جہاد کا معنی ومفہوم ذہنوں میں بھانے اور اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اخوان نے جو ذرائع ووسائل اور طریقے اپنائے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رسول اکرمؐ کے دور مبارک کی بڑی جنگوں، مثال کے طور پر غزوۂ بدر اور فتح مکہ کی تاریخوں میں جشن منائے گئے۔

ایک خاص طریقہ یہ بھی اپنایا گیا کہ سیرت نبوی کی ایک جامع کتاب یا کئی کتابوں کا

انتخاب کیا گیا اور اخوانی حلقوں اور کنبوں میں انہیں پڑھا گیا اور ان کا مطالعہ کر کے نئی روشنی حاصل کی گئی۔ حضور کریم کی سیرت دراصل اللہ کی راہ میں مسلسل جہاد کا سبق دیتی ہے اسی لیے قدیم زمانے میں سیرت کی کتابوں کو "مغازی" (غزوات) سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور علم فقہ میں "کتاب الجہاد" کو "کتاب السیر" کہا گیا ہے۔

قرآن کریم کی جن سورتوں کو حفظ کرنے اور ان کا مطالعہ کرنے کی آغاز میں اخوانیوں کو تاکید کی جاتی ہے ان میں سورہ انفال بھی ہے تاکہ جہاد کا وہ مفہوم ذہنوں میں سما سکے جس سے مسلمان سے ایک لمبے عرصے سے غافل رہے ہیں۔

اخوان کی ثقافت و تربیت اس ڈھنگ سے کی گئی کہ ان کے اندر عزت و شرافت کا تصور جاگ سکے۔ سخاوت و دریا دلی اور انفاق و بخشش کی روح بیدار کی جائے، ان کے اندر اپنے مقصد کے لیے فداکاری اور شہادت کا جذبہ کروٹیں لے سکے نیز ان کے کشت دل میں تنظیم و اطاعت کی تخم ریزی بھی کی گئی اور اپنی ذات کو جماعت اور سماج کی راہ میں فنا کر دینے کا جذبہ بھی پیدا کیا گیا۔

اور یہ تمام صفات اس وقت مجسم شکل میں سامنے آ گئیں جب ۱۹۳۸ء میں فلسطین کو یہودیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے صدا لگائی گئی۔ اس وقت اخوان جنت کی خوشبوں حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو گئے اور دعوت اسلامی کے نوجوان ہر گوشہ سے ارض مقدس میں جہاد کا شرف حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ یہاں تک کہ اس میدان میں مقابلہ اور مسابقت کی نوبت آ گئی تاکہ دو کامرانیوں میں سے کوئی ایک ان کے حصے میں آ جائے یا تو یہودی فتنے کا سر کچل دیں یا اس راہ میں اللہ سے جا ملیں۔

میں "طنطا" کے دینی ادارے کے ہم جماعت بھائی عبدالوہاب البیتانونی کو نہیں بھول سکتا اسے فلسطین میں جہاد کرنے کا شوق ہوا اور یہ شوق اس قدر بڑھا کہ اس کے دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ لیکن اس پاکیزہ مقصد کے حصول میں اس کے سامنے دو رکاوٹیں تھیں۔

پہلی رکاوٹ اس کی ماں تھی جو اپنے بچے سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی، خاص طور سے اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی جدائی برداشت کرنے کو تیار نہ تھیں تو بھلا اس کی موت کیسے گوارا کر سکتی تھی؟ اس لیے اس نے جہاد پر جانے کی اجازت نہ دی اور اخوان کے رضا کار دستوں میں اس کو اپنا نام نہ لکھوانے دیا۔ ہمارا یہ بھائی اپنی ماں کی اطاعت وخوشنودی کو اہم سمجھتا تھا اور بغیر اس کی اجازت اور رضا کے جہاد میں شریک ہونا اس کے لیے واجب نہ تھا۔ ہم اس کی ماں کے پاس گئے اسے جہاد کی فضیلت اور مجاہدین کا مقام ومرتبہ یاد دلایا۔ مسلم سورماؤں کے قصے سنائے، ان کی ماؤں کے صبر وضبط کے واقعات اور نمونے اس کے سامنے رکھے اور ہم برابر اس میں لگے رہے یہاں تک کہ محبت والفت اور پیار کے آنسو بہاتے ہوئے اس نے شرکت کی اجازت دے دی۔

دوسری رکاوٹ خود اخوان کی طرف سے تھی اس لیے کہ تنظیم نے ہائی اسکول کے بچوں کو کم سنی کی وجہ سے ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہ دی تھی۔ بھائی البتانونی نے ہم سے تقاضا کیا کہ ہم طنطا سے قاہرہ مرشد سے ملاقات کے لیے چلیں تاکہ اصرار کر کے اخوانی دستوں میں شامل ہونے کی اجازت لی جاسکے، خاص طور سے جب کہ اس کی ماں نے اسے اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ میں نے بھائی احمد عسال اور بھائی محمد صفطاوی کو ہمراہ لے کر استاذ البناء سے ملاقات کی، ان کے سامنے ساری روئداد سنائی اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ استاذ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور اسے جہاد میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔

ہمارا یہ ساتھی اجازت پا کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ ہم نے اس کا تذکرہ استاذ بہی الخولی سے کیا تو انہوں نے کہا "عبدالوہاب کا اخلاص شہیدوں کا اخلاص ہے میں جب بھی اسے دیکھتا ہوں تو اس کے چہرے پر شہادت کا خون بہتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔" اور یہی ہوا عبدالوہاب اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک بہادرانہ آپریشن میں شہید ہو گئے۔ انہوں نے ہتھیاروں کے ذخائر جس پر یہودی قابض ہو گئے تھے کو اڑا دیا۔ اس میں بم رکھ کر آگ لگا دی اور ایک ہی سکینڈ میں یہ گودام

راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ تینوں اخوان اپنے رب سے جا ملے۔

جہاد کا یہ جذبہ اور ولولہ شہید البنا تک محدود نہ تھا۔ کتنے ہی نوجوان تھے جو اپنے گھروں سے اس لیے بھاگ گئے تھے کہ "پاکستب" کی فوجی تربیت گاہ میں داخل ہو سکیں۔ کتنوں کے والد اور چچاؤں نے انہیں ان کے عزم راسخ سے پھیرنا چاہا اور ماضی کی زندگی پر مطمئن رکھنا چاہا لیکن ان جوانوں کے اصرار کے آگے ان کی دال نہ گلی، امر واقعہ یہ کہ انہیں راضی ہونا پڑا اور انہیں یقین ہو گیا کہ ایمان کی روح اس نسل کے دل میں سرایت کر گئی ہے جس نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے وہ موت سے بے نیاز و بے پروا ہو گئے ہیں اور اللہ کی راہ میں شہادت ان کی بہترین آرزو بن گئی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بہت سے نوجوان کہتے تھے۔ "میری قوم کے لوگو! مجھے چھوڑ دو، جنت مجھے آواز دے رہی ہے۔"

ان میں ایسے افراد کی تعداد بھی کم نہ تھی جو سفر کی مصیبتیں جھیل کر یا صحرا سینا کی تپتی ریت میں پیدل چل کر اخوان مجاہدین کے فوجی کیمپ تک پہنچے۔

ایسے بھی تھے جنہوں نے قبلہ اول کی بازیابی کے لیے جنگ میں حصہ لیا اور انہیں بندوق یا توپ خریدنے کے لیے اپنی ملکیت بیچنا پڑی۔

ایسی بیویاں بھی تھیں جنہوں نے اپنے شوہروں کو مسلح کرنے کے لیے خوشی خوشی اپنے زیورات بیچ دیئے اس طرح انہیں جہاد کا دوہرا ثواب حاصل ہوا، ایک تو اپنی محبوب ترین چیز سے دست بردار ہونے کا اور دوسرے اپنے محبوب کی جدائی پر رضامندی کا۔

مرکز بسیون کے ایک اخوانی کسان حسن الطویل مجھے اب تک یاد ہیں اس بھائی نے اپنے اہل و عیال اور کھیتی باڑی کو اللہ کے حوالے کر کے رضاکاروں کے دستے میں اپنا نام لکھوا لیا۔ اتنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی بھینس بھی بیچ دی تاکہ دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے ہتھیار وغیرہ خرید سکیں۔ اس علاقہ کے امیر الحاج احمد البس نے جب ان سے کہا "اے حسن بھینس کو اہل و عیال کے لیے چھوڑ دو، تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ تم اپنی جان ہتھیلی پہ لے کر میدان

میں نکل پڑے ہو، جو لوگ جہاد میں شریک نہیں ہو رہے ہیں ان پر فرض ہے کہ وہ اپنا مال اس راہ میں خرچ کریں۔" تو اس مرد مومن نے جو جواب دیا وہ بڑا بصیرت افروز ہے اس نے کہا "کیا اللہ نے صرف جان سے جہاد کرنے کا مطالبہ کیا ہے؟ یا جان و مال دونوں کو اللہ کی راہ میں لٹانے کا حکم دیا ہے؟ کیا جنت کے عوض اللہ نے ہماری جان خریدی ہے یا جان و مال دونوں کا سودا ہو چکا ہے۔ کیا قرآن کی اس آیت کو بھول گئے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ:۱۱۱)

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جان اور ان کے مال خرید لیے ہیں جنت کے عوض میں) کیا تم یہ چاہتے ہو بغیر قیمت کی ادائیگی کئے سامان خرید لو؟"

اس مومنانہ جواب اس بے باکانہ اصرار کے آگے کوئی کیا کہہ سکتا تھا، چنانچہ حسن بھائی نے جنگ کرنے والوں کے ساتھ سفر کیا اور آخر میں محاذ سے واپس ہوئے لیکن ان کی واپس ہوئے لیکن ان کی واپسی اس لیے نہیں ہوئی کہ انہیں عزت و اکرام اور اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا بلکہ صیہونیوں کے خلاف جنگ میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے تھے اس کا بدلہ چکانے کے لیے انہیں قید خانے میں بند کر دیا گیا، مغربی جلادوں کے علاوہ سعد الدین اسحاطی کی ڈیوٹی بھی آپ ہی کی "خدمت" کے لیے لگائی گئی تھی چنانچہ ہمارے کسان بھائی نے قید خانے میں جس جرات اور صبر کا مظاہرہ کیا اس کا تذکرہ سعد الدین بڑے فخر و انبساط سے کیا کرتا تھا۔

یہی پاکیزہ و تابناک روحیں تھیں جنہوں نے یہودیوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا جب بھی کہیں قریب سے اخوان رضا کار دستوں کا نام سنا یا جاتا یا دور سے ان کے نعرہ اللہ اکبر کی آواز آتی یہود خوف کے مارے کانپ اٹھتے۔

کسی یہودی نے ہمارے ایک مجاہد بھائی معروف حضری سے، جب وہ قید میں تھا کہا "ہمیں اگر خطرہ ہے تو بس ان اخوانی رضا کاروں سے اور کسی سے ڈر نہیں ہے۔" معروف نے

اس سے پوچھا "تم لوگ ان سے کیوں ڈرتے ہو جب کہ ان کی تعداد بہت تھوڑی اور ان کے ہتھیار بہت معمولی ہیں۔"

صیہونی پولیس نے چیخ کر کہا "ہم دنیا کے کونے کونے سے اس خطہ میں اس لیے آئے تھے کہ چین سے زندگی بسر کرسکیں گے اور یہ لوگ یہاں اس لیے آئے کہ انہیں لڑتے لڑتے موت آ جائے، جو زندگی کا خواہش مند ہو اور جسے موت کی تلاش ہو، ان دونوں کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔"

میدان جنگ میں اخوانی دستوں کے قائدے کے سامنے ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ جب کسی دستے یا فرد کو جنگ میں گھسنے کا حکم دیا جاتا تو بقیہ افراد اور دستوں کو خاموش رکھنا مشکل ہو جاتا۔ سب کے سب جہاد کا شرف حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جاتے۔ کبھی کبھی یہ مرحلہ تو قرعہ اندازی تک پہنچ جاتا پھر انہیں اپنی باری آنے تک خاموش رہنے پر راضی کیا جاتا۔ ہر دستہ کے افراد نعرہ تکبیر لگاتے اور شہادت و جہاد کی آیتیں پڑھ پڑھ کر شعلہ جوالہ یا سیماب صفت نظر آتے۔ وہ بار بار نعرہ لگاتے۔ هبی ریح الجنۃ هبی (چل اے جنت کی خوشبو اچل میرے دل و دماغ کو معطر کردے)

استاذ کامل الشریف نے اپنی ڈائری "الاخوان المسلمون حرب فلسطین میں" میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ نوجوان مجاہد عبدالحمید خطاب، جو بہادر عالم دین شیخ ہسیونی کی نسل سے تھا کی ڈیوٹی معرکہ دیر العلم میں یہ لگائی گئی کہ وہ فوجی کیمپ کی حفاظت کے لیے یہیں موجود رہے اور میدان جنگ میں نہ جائے، یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا، شدت جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور قائد سے اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ اسے بھی جنگ کرنے والوں میں شامل کرلیا گیا۔ اس کی تمنا بر آئی اور اللہ کی راہ میں شہادت کی خلعت زریں اسے نصیب ہوئی۔

اخوان مجاہدین کے بارے میں جو کچھ میں نے سنا وہ عبرت و موعظت کے لیے کافی ہے

وہ میدان کارزار میں غسل کر کے اور وضو بنا کر جاتے، دلوں میں ایمان کی گرمی ہوتی۔ جیبوں میں قرآن پاک ہوتا اور ہاتھوں میں بندوقیں ہوتیں، ان میں سے کسی کو گولی لگتی تو تکبیر کہتا اور کلمہ شہادت پڑھتا اور کہتا:

عَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی

"اے میرے رب میں تیری بارگاہ میں جلدی پہنچ آیا تا کہ تو خوش ہو جائے"

کسی اخوانی کی پنڈلی پر توپ کے کچھ ذرات پڑے اور پنڈلی کٹ گئی، اس کے ساتھی رونے لگے اور اس کا حال یہ تھا کہ مطمئن اور فرحاں وشاداں اپنی کٹی ہوئی پنڈلی کو دیکھ رہا تھا اور صحابی حضرت خبیبؓ کا مشہور شعر اس کی زبان پر تھا۔

ولست ابالی حین اقتل مسلماً
علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی
وذالک فی ذات الا لہ و ان یشاء
یبارک علی أوصال شلو ممزع

"مجھے کوئی پرواہ نہیں اگر میں ایک مسلم کی حالت میں قتل کیا جاؤں، کہ کسی پہلو اللہ کی راہ میں مجھے پچھاڑا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی راہ میں ہے اگر وہ چاہے تو ان ٹکڑے ٹکڑے اعضا میں برکت و بالیدگی پیدا کر دے۔"

ایک معرکے میں دستے کے کمانڈر بھائی سید محمود اپنے قاتل کو مار کر خود زخمی ہو گئے۔ جب وہ گرے تو اخوانیوں کی بھیڑ لگ گئی، انہوں نے اسی حالت میں انہیں سختی سے ڈانٹا کہ جنگ ان کی زندگی سے زیادہ اہم تھی۔ جب انہیں پچھلی صفوں میں لے جایا گیا تو ہوش میں آ گئے اور ان کا سب سے پہلا سوال معرکہ کی رفتار کے بارے میں تھا۔ انہیں اطمینان بخش جواب ملا تو مسکرا پڑے اور الحمد للہ کہا عالم نزع میں اپنے دین اور اپنی امت کی کامرانی کے لیے دعا کرتے رہے ان کی زبان ایک منٹ کے لیے بند نہ ہوئی وہ خدا سے روتے رہے۔

"اے اللہ تو ہماری دعوت کی مدد کیجیو اور ہمارے مقصد کو پورا کیجیو!"

یہاں تک کہ وہ اسی حالت میں اپنے رب سے جا ملے۔

یہ چند مثالیں جنہوں نے قرن اول کے کارناموں کی یاد تازہ کر دی اور ثابت کر دیا کہ امت بحیثیت مجموعی ہمیشہ خیر سے جڑی ہے اور اس کی شخصیت کی ترقی و کامرانی کی کلید صرف اسلام ہے یہی اس کے تمام کارناموں کا مرکز و محور اور اس کی تمام طاقتوں کا نقطہ انجار رہا ہے اور اگر ایمان کی پکار اور اسلام کی تربیت اس امت کو بیدار نہ کر سکے اور ترقی و کامرانی کے مراحل طے نہ کرا سکے تو قومی اور وطنی تحریکوں اور فلسفوں میں یہ دم خم نہیں ہے کہ وہ اس امت کو بیدار کر سکیں اور اس کے اندر حرکت و عمل کی روح اجاگر کر سکیں۔

استاذ کامل الشریف نے اپنی کتاب "الاخوان المسلمون حرب فلسطین میں" میں جن بہادرانہ کارناموں اور جرات آموز داستانوں کو نقل کیا ہے ضروری ہے کہ انہیں نئی نسلوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ تاکہ وہ ان سے عبرت و موعظمت حاصل کر سکیں اور حرکت و عمل کی روح بیدار ہو، گرچہ یہ واقعات صرف ان کے اپنے تجربات ہیں۔

جنگ فلسطین میں مصری فوج کے کئی کمانڈروں نے اس محکمہ کے سامنے اخوان کی بہادری کی گواہی پیش کی جس نے جیپ گاڑی کے قضیہ میں فدائی اخوانیوں کے حق میں فیصلہ دیا تھا اس سے مومنین کے دل ٹھنڈے ہوئے اور منافق غیظ و غضب میں مبتلا ہوئے اور پیچ و تاب کھانے لگے۔

کمانڈر الملواوی نے بیان دیا کہ :

میجر جنرل فواد صادق کا بیان ہے کہ "اخوان بہادر فوجی ثابت ہوئے انہوں نے اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دیں۔"

اور دوسری جنگ پایہ تکمیل کو پہنچی جس میں اخوان کی بہادری کھل کر سامنے آ گئی اور ان کی مجاہدانہ تربیت نے اپنا کام کیا۔

میری مراد معرکہ نہر سویز اور انگریزوں کی لڑائی سے ہے استاذ شریف نے اپنی کتاب "المقاومۃ السویۃ فی قناۃ السویس" میں اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

میرا گمان ہے کہ شاید ہی کوئی اخوانی شہدا کو بھول سکے۔ خاص طور سے یونیورسٹی کے طالب علم عمر شاہین، احمد انمیسی اور عادل خاتم اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو، جنہوں نے معرکہ "ابی الکبیر" میں اپنے گرم گرم اور پاکیزہ خون سے یہ سطریں رقم کیں کہ قابض سامراج آزادی نہیں دیا کرتا بلکہ مجاہدین اپنا خون دے کر اسے حاصل کرتے ہیں۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اخوانیوں نے گرچہ جنگ کا اہتمام کیا، بالفعل اس کی مشق کی اور میدان جنگ میں اپنے بہترین اور قیمتی افراد کی قربانیاں دیں لیکن اس کے باوجود جہاد ان کے نزدیک صرف یہیں تک موجود نہ تھا۔

انہوں نے اسلام سے جہاد کا جو مفہوم سمجھا تھا وہ جنگ کے مفہوم سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔

جب سرزمین اسلام کے کسی حصے پر قابض سامراج سے جنگ کرنا اور غاصبوں اور لٹیروں سے لڑائی کرنا ایک محکم فریضہ ہے اور کافرانہ استعمار اور مستعمرانہ کفر کا مقابلہ کرنا ایک مقدس دینی ذمہ داری ہے تو منافقوں، بدعتیوں سے جہاد اور ظالموں اور فاسقوں کے خلاف جنگ کی فرضیت کی اہمیت اور پاکیزگی کس طرح کم ہو سکتی ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبہ ۷۳)

"اے نبی کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔"

رسول اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ افضل جہاد کون سا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا کسی جابر بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اندرونی فساد اور داخلی بگاڑ کا مقابلہ غیر بیرونی حملہ آوروں سے

جنگ دونوں ہماری ذمہ داری ہے اور دونوں کے خلاف جد و جہد جہاد میں شامل ہے۔

نبی کریمؐ نے ان ظالم امراء کی نشاندہی کی ہے جن کا قول و عمل یکساں نہیں ہوتا اور وہ احکام خداوندی کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں اور انکے زیر حکومت رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داری بھی بتادی ہے :

مَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ

"جو ان سے اپنے ہاتھ سے جنگ کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے اپنی زبان سے جنگ کرے وہ مومن ہے اور جو اپنے دل سے جنگ کرے وہ بھی مومن ہے اور اس کے بعد رائی کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا۔"

یہاں یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جہاد بالقلب یعنی ان ظالموں سے نفرت کرنا، ان کے خلاف غصہ رکھنا اور ان سے قطع تعلق کرنا، یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے اور یہ اس شخص کے لیے ہے جو زبان سے جہاد کرنے پر قادر نہ ہو، اسی طرح زبانی جنگ کی گنجائش صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو قوت و طاقت کے ذریعہ جہاد کرنے سے عاجز ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد صرف کافروں ہی سے نہیں کرنا ہے اور تلوار ہی جہاد کا واحد ذریعہ نہیں ہے کیونکہ اللہ نے قرآن پاک میں منافقوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ منافقین سے تلوار سے جنگ نہیں کی جاسکتی کیونکہ ظاہری طور سے ان کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے، ان سے جہاد وعظ و نصیحت، دلائل و براہین اور موثر و دلنشین گفتگو سے ہی ممکن ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا :

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (النساء:۶۳)

"اللہ جانتا ہے جو کچھ انکے دلوں میں ہے ان سے تعرض مت کرو۔ انہیں سمجھاؤ اور نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔"

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان:۵۲)

"پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔"

سورہ فرقان مکی ہے جہاد کا یہ حکم اس وقت نازل ہوا تھا جب کہ جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی چہ جائیکہ اس کا حکم دیا جائے۔

اس لیے جہاد کبیر سے مراد دعوت تبلیغ کی جدوجہد اس کی مشقتوں اور مصائب کو برداشت کرنا اور دراز سفر کے باوجود ثابت قدمی سے اسی کام میں لگا رہنا ہے اس مفہوم کی طرف اشارہ سورہ عنکبوت کے آغاز میں بھی ملتا ہے۔

وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (العنکبوت:۶)

"جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا، اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا۔ اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے۔"

رسول کریمؐ نے کفار سے جہاد کے طریقے اور اس کی شکلیں یوں بتائی ہیں۔۔

جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِاَيْدِيْكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ (حدیث)

"مشرکین سے اپنے ہاتھوں، اپنے مالوں اور اپنی زبانوں سے جہاد کرو۔"

ان سب کے ماسوا نفس سے بھی جہاد کرنا ہے تاکہ وہ اسلام کی تعلیم سیکھے اس پر عمل کرے اس کی دعوت دے اور اس کے راستے پر گامزن رہے تا آنکہ دو میں سے ایک کامرانی اسے حاصل ہو جائے یا تو گوہر مقصود کو پا جائے یا لیلیٰ شہادت سے ہم آغوش ہو جائے۔

شیطان مختلف طریقوں اور حربوں سے انسان پر حملہ کرتا ہے اس کے دلوں میں شک و

تذبذب کے بیج بوتا ہے تاکہ اس کی عقل گمراہ ہو جائے، شہوات کی راہ دکھاتا ہے کہ ارادہ میں کمی آجائے اس لیے اس سے بھی جہاد کرنا ہے۔ یقین کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کرنا ہے تاکہ شکوک وشبہات دور ہو جائیں اور صبر وثبات کے ذریعہ اسکے حربوں کو ناکام بنا دینا ہے اور شہوات کو مار بھگانا ہے۔ اسی سے ان معرکوں میں شیطان پر غلبہ پایا جا سکتا ہے اور صبر ویقین کے بازوؤں کے سہارے انسان دینی امامت تک پہنچ سکتا ہے :

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ

(السجدۃ ۲۴)

"اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کئے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔"

اسلام کی نگاہ میں جہاد کا جو مفہوم سمجھا تھا اور جسے وہ اپنے پیروکاروں کی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے اس کی وضاحت انہوں نے "رسالۃ التعلیم" میں کی ہے لکھتے ہیں :

"اور جہاد سے میری مراد قیامت تک جاری رہنے والا فریضہ ہے اور جس کی طرف رسول اکرمؐ کے اس قول میں اشارہ ہے "جو اس حال میں مرا کہ اس نے جنگ کی نہ کی اس کی کبھی خواہش کی تو اس کی جاہلیت کی موت ہوئی۔"

"اس کا پہلا زینہ باطل سے نفس کی بیزاری ہے اور اعلیٰ ترین مقام اللہ کی راہ میں جنگ کرنا ہے ان دونوں کے درمیان زبان، قلم اور ہاتھ سے جہاد کرنا اور ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا۔"

"کوئی دعوت، بغیر جہاد کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ دعوت کی عظمت اور اس کے افق کی وسعت کے اعتبار سے اس کی راہ میں جہاد کی اہمیت وفضیلت بھی بڑھ جاتی ہے نیز اس دعوت کو استوار اور پائیدار بنانے کے لیے اتنی ہی بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے پھر اسی لحاظ سے کام کرنے والے زیادہ اجر و

ثواب کے مستحق ہوتے ہیں پس اے مسلمان بھائی راہ خدا میں جہاد کرو اس میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرو۔"

جہاد کے اس وسیع مفہوم کی بنیاد پر اخوان کی تربیت کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ وہ اسلامی فکر کی راہ میں جہد کرتے ہیں ان کا جہاد "اسلامی سرزمین" کی راہ میں ہوتا ہے بلکہ فکر ہی اصل غایت اور مقصود ہوتا ہے اور زمین کا حصول تو محض وسیلہ اور ذریعہ ہوتا ہے اسی وجہ سے خارجی طاغوت کے مقابلے میں جس طرح انہوں نے جنگ کی اسی طرح اندرونی طاغوت کو پچھاڑنے کی بھی انہوں نے پوری کوشش کی۔ دہریوں، ملحدوں اور مادہ پرستوں کا اسی طرح مقابلہ کیا جس طرح غاصبوں اور ظالموں کا کیا۔ سرزمین اسلام میں زیادتی کرنے اور چڑھ دوڑنے والوں اور شریعت اسلامی پر ظلم کرنے والوں کے درمیان انہوں نے کوئی فرق روا نہ رکھا۔ اسی لیے شریعت کی برتری اور غلبہ کے لیے انہوں نے ویسی ہی جدوجہد کی جس طرح جدوجہد آزادی وطن کے لیے کی۔ نام نہاد مسلم فاجروں اور فاسقوں کے ہاتھوں ان کا خون اسی طرح بہا جس طرح یہودیوں اور کافر انگریز کے ہاتھوں بہا۔ اور لیمان طرہ، القلعہ جنگی قید خانوں اور دوسرے تعذیبی میدانوں میں ان کے شہداء کی تعداد کم و بیش اتنی ہی ہے جتنی سرزمین فلسطین اور نہر سویز کے محاذوں میں ہے۔

اندرون و بیرون کتنی ہی خفیہ و نمایاں طاقتوں نے کوشش کی کہ اخوان کو مال و منال اور جاہ و حشم کے بدلے خرید لیں اور اس طرح تحریک کو گھیرنے اور اس پر قابض ہونے کا انہیں موقع مل جائے لیکن ان طاقتوں کو اخوان اور انکے مرشد نے کوئی اہمیت نہ دی۔ انہیں اس صریح انکار کے سوا اور کوئی جواب نہ مل سکا۔

أَتُمِدُّونَنِ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ اللَّهُ خَيْرٌ مِّمَّا آتَاكُمْ بَلْ أَنتُم بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ (النمل ۳۶)

"کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے۔ وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے تمہارا حصہ تمہی کو مبارک رہے۔"

جس عہدوں اور مناصب کی لالچ اور مال و دولت کی کشش انہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی تو ڈراوے اور دھمکیوں سے مرعوب کرنے کی کوشش ہوئی اور پیار و محبت کے دام تزویر کٹ جانے کے بعد خوف و دہشت کا جال بچھایا گیا یہ وار بھی خالی گیا اور دشمنان دین اپنے بچھائے ہوئے پھندوں میں خود پھنس گئے اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت کی خواہش اور بڑھ گئی اس پر ثابت قدمی اور اولوالعزمی میں مزید اضافہ ہو گیا گرچہ انہیں نار نمرود اور قتل فرعون کی دھمکی دی گئی یا ان کے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند رکھ دینے کی پیش کش کی گئی۔

اسلام اور مسلمانوں کے مسائل و معاملات میں اخوان نے یہ سخت موقف اور بے لچک پالیسی اختیار کی اور کسی قسم کی سودے بازی سے یکسر انکار کر دیا تو تحریک کو مختلف قسم کی چالوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے ختم کر دینے کی خفیہ سازشیں ہوئیں بلکہ قوت و طاقت مہیا ہونے پر اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا منصوبہ بنایا گیا۔

یہی راز ہے کہ پے در پے سخت آزمائشیں آئیں اور اخوان پر تیز و تند حملے کئے گئے وہ ایک آزمائش کی بھٹی سے ابھی نکلے ہی تھے کہ دوسری آزمائش منہ کھولے انہیں تیار نظر آئی۔

اس کے باوجود لالچ اور دھمکی، کسی چیز کے سامنے اخوان نہ جھکے نہ آزمائش سے پہلے نہ دوران میں اور نہ آزمائش کے بعد، ان تمام مراحل میں مردوں جیسا صبر کیا۔ سورماؤں کیطرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے یا یوں کہہ لیجئے کہ مومنین کی سی پامردی دکھائی جنہوں نے اللہ سے کئے گئے معاہدے کو سچ کر دکھایا۔

لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو، ان بھیانک مظالم کی تاب نہ لا سکے اور اپنی زبان یا نوک قلم سے بادل نخواستہ ایسی بات کہہ دی سے انہیں ان ظالموں کے چنگل سے رہائی مل جائے انہوں نے اللہ کے اس قول سے فائدہ اٹھایا:

إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ (النحل ۱۰۶)

"مگر جسے مجبور کیا گیا اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو تو اس کے لیے رخصت ہے۔"

لیکن انہیں اطمینان تھا کہ انہوں نے کفر کو شرح صدر سے قبول نہیں کیا ہے اور ظلم کی مدح سرائی نہیں کی ہے اور اسلام سے دور نہیں ہوئے ہیں اس لیے اپنی جان بچانے کے لیے یہ حرکت کر گزرے ہیں لیکن جلد ہی نادم ہوئے اور اپنے رب سے مغفرت چاہی، اپنی اس حرکت پر روئے پچھتائے اور جماعت سے معذرت طلب کی اور سب سے پہلے خدا کے حضور سچے دل سے توبہ کی۔

## اجتماعی تربیت :

اخوان کی تربیت میں اس عنصر کو خاصا دخل ہے کہ سوسائٹی کی بھلائی کے لیے کام کرنا ایک مسلمان کے پیغام کا جزو ہے۔ قرآن کریم سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس پیغام کے تین اجزاء ہیں ایک جزو تو خدا سے عبادت کے ذریعہ تعلق سے بحث کرتا ہے، دوسرا جزو بندوں کے حقوق اور ان کی بھلائی کے لیے جدوجہد کرنے سے متعلق ہے اور تیسرے جز میں دشمنوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ (الحج: ۷۷، ۷۸)

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو، اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔"

مختلف احادیث اس مفہوم کی وضاحت کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ ہر مسلم پر روزانہ ٹیکس یا اجتماعی زکوۃ فرض ہے جسے وہ اپنے مال "اپنے رتبہ، اپنے بدن، اپنی فکر اور اپنی زبان سے ادا کرے۔"

امام بخاریؒ نے روایت کی ہے کہ ابو موسیٰؓ نے فرمایا:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ قِيلَ أَرَأَيْتَ إِنْ لَمْ يَجِدْ

قَالَ يَعْتَمِلُ بِيَدَيْهِ فَيَنْفَعُ نَفْسَهُ وَيَتَصَدَّقُ قَالَ أَرَأَيْتَ إِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ، قَالَ: يُمْسِكُ عَنِ الشَّرِّ فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ (بخاری و مسلم)

"اللہ کے رسولؐ نے فرمایا! ہر مسلمان پر صدقہ واجب ہے، پوچھا گیا، اگر اس کے پاس دولت نہ ہوں تو آپ کیا کہتے ہیں؟ فرمایا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے کام کرے خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے، سوال کیا، اگر اس کے اندر اس کی استطاعت نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا: وہ معروف بھلائی کا حکم دے پوچھا گیا اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو؟ آپؐ نے جواب دیا۔ وہ برائی سے دور رہے یہ بھی صدقہ ہے۔"

اسی وجہ سے مسلم معاشرے کا ہر فرد سوسائٹی کے لیے نفع بخش اور بارآور تھا۔ بھلائی کا کام کرتا اور اس کی دعوت دیتا تھا شر سے خود بچتا اور دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا تھا محتاج کی خبر گیری کرتا اور کمزور کا ہاتھ پکڑتا تھا جاہل کو تعلیم دیتا اور غفلت میں پڑے ہوئے انسان کو متنبہ کرتا تھا گناہ گار کو خدا کے خوف سے ڈراتا اور خدا کو بھول جانے والے کو تذکیر کرتا تھا مریضوں کی عیادت کرتا اور اس کے دوا دارو کا انتظام کرتا تھا۔ میت کے آخری رسوم میں شریک ہوتا اور اس کے اہل و عیال کو صبر و شکیب کی تلقین کرتا تھا۔ یتیموں کی عزت اور مسکینوں کو کھانا کھلانے پر دوسروں کو اکساتا اس کی عادت تھی اور سوسائٹی کو اوپر اٹھانے والے ہر کام میں شرکت اس کی خاص صفت تھی گرچہ اس کی طرف اقدام کرنے اور اس کی دعوت دینے کی اس کے اندر طاقت و صلاحیت نہ ہوتی تھی۔

اخوان کے تمام شعبے اور اس کی تمام شاخیں اجتماعی اصلاح کا مرکز اور خدمت خلق کا سینٹر ہوتی تھیں۔ انہیں جتنے کچھ وسائل مہیا تھے وہ سب انہوں نے قوم و ملک کی خدمت میں لگا رکھے تھے۔ تعلیم و تربیت سے لے کر علاج و شفا تک ہر کام کرتے تھے۔ اجتماعیت کا پاس و لحاظ اور

دینی و دنیوی رہنمائی ہر خدمت خوشی خوشی انجام دیتے تھے۔

"نیکی اور خدمت خلق" کے شعبہ کے تحت اخوان نے طبی شفا خانے قائم کئے جن میں معمولی اجرت پر مریضوں کا علاج ہوتا تھا اور محتاجوں اور ضرورت مندوں کے مفت علاج کی سہولتیں میسر تھیں۔ یہ شعبہ زکوٰۃ و صدقات کی رقم اکٹھی کر کے مستحقین میں تقسیم کرتا تھا، جہالت و ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے صباحی و شبینہ اسکول چلاتا تھا، حفظ قرآن اور تعلیم بالغان کے مدارس اس کی نگرانی میں چل رہے تھے۔ عبادات کی ادائیگی اور ہدایت و رہنمائی کا کام کرنے کے لیے ضرورت کے تحت نئی مسجدیں بنوانا یا پرانی مسجدوں کی مرمت اور آبادکاری اس کے فرائض میں شامل تھی۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلافات ختم کرنے کے لیے اس شعبہ نے کمیٹیاں بنائی تھیں۔ معاشرے کو درپیش تمام مسائل و مشکلات کو حل کرنے میں یہ شعبہ پیش پیش رہتا تھا اور اس کی ترقی و کامرانی کے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی جدوجہد کرتا تھا۔

اس سلسلے میں اخوان کی پالیسی اور اس کا پروگرام خود اسلام سے مستفاد تھا ایک مسلم فرد اور مسلم سوسائٹی کی جو خصوصیات اسلام نے بتائی ہیں وہ خود اس پالیسی اور پروگرام کا تقاضا کرتی تھیں لیکن بعض لوگوں..... حزب التحریر نے اخوان پر اعتراض کرنا شروع کیا کہ ان اجتماعی کاموں میں الجھنے سے ایک طرف تو دعوت و تبلیغ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور اس پر سے توجہ ہٹنے لگتی ہے اور دوسری طرف یہ جزوی اصلاح ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں اور اس کی وجہ سے "اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ، اور اس کے لیے دوڑ دھوپ سوسائٹی کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ لوگ کئی اہم حقائق سے غافل ہیں۔

۱۔ بھلائی کا کام دعوت کا ایک ایسا اہم حصہ ہے جسے ایک مسلم کی ذمہ داری سے کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا اس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں سنت نبوی اور قرآن حکیم میں اس کے واضح دلائل موجود ہیں۔ خیر اور معروف کا کام کرنے اور اس کی

دعوت دینے پر ایک مسلم اسی طرح مامور ہے جس طرح نماز اور دوسری عبادات پر۔

۲۔ مسلمان اپنے معاشرے کے جسم کا ایک زندہ عضو ہے اس کی تکمیل اور پریشانیوں کا احساس کرنا اور ان کا ازالہ کرنے یا ان کو کم کرنے کی کوشش کرنا اس کی بنیادی ذمہ داری ہے اس کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ کسی بھوکے یا مریض کے سامنے تماشائی بن کر کھڑا رہے جبکہ اس کی اعانت پر اسے قدرت حاصل ہو۔

۳۔ بھلائی کے کاموں میں شرکت خود دعوت کا ایک اہم حصہ ہے جس طرح سے زبان اور قلم سے دعوت دی جاتی ہے اسی طرح احسان و عمل کی زبان بھی دعوت کا کام کرتی ہے عیسائی مشنریاں اور دوسرے مذاہب اس کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ معاشرے میں کچھ ایسے عناصر بھی پائے جاتے ہیں جو فکری و تربیتی کام تو نہیں کر سکتے لیکن معاشرے کی خدمت بخوبی کر سکتے ہیں ایسے عناصر کو بیکار چھوڑ دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

## سیاسی تربیت :

اخوانیوں کی تربیت کا ایک قابل لحاظ پہلو سیاسی بھی ہے سیاست سے ہماری مراد وہ معاملات ہیں جو حکومت، نظام حکومت اور عوام کے درمیان ربط، حکومت اور دوسری اسلامی وغیرہ اسلامی مملکتوں کے درمیان روابط، غاصب سامراج سے تعلق کی نوعیت اور اسی طرح کے دیگر متعدد و متنوع مسائل سے بحث کرتے ہیں۔

حسن البنا کی دعوت اور ان کے مکتب فکر کے قیام سے پہلے تمام اسلامی جماعتوں... بلکہ صحیح ترین لفظوں میں انہیں دینی جماعتیں کہنا چاہیے... نے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور ان کی سرگرمیوں، چلت پھرت اور غور و فکر کے دائرے سے یہ چیز بالکل باہر تھی جس طرح کالے اور گورے میں بڑا فرق سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں چیزوں کا ایک فرد یا ایک جماعت میں پایا جانا محال تصور کیا جاتا تھا اس وقت دو قسم کے افراد ہوتے تھے یا تو خالص دیندار یا خالص سیاسی،

پارٹیاں بھی یا تو خالص دینی ہوتی تھیں یا محض سیاسی، ان دونوں کے بیچ میں کسی معتدل جماعت یا فرد کی گنجائش نہ تھی۔

کسی دیندار فرد یا جماعت کے لیے سیاست میں حصہ لینا یا سیاسی مسائل سے دلچسپی لینا حرام سمجھا جاتا تھا اسی طرح کسی سیاسی فرد یا پارٹی کو دین کے معاملہ میں بولنے یا دخل دینے کا قطعی حق نہ پہنچتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی ارباب سیاست اپنی حدود پھلانگ کر دین کے دائرے میں بھی قدم رکھ دیتے تھے البتہ جو چیز ناقابل معافی تھی وہ یہ کہ کوئی دیندار فرد یا جماعت سیاسی مسائل میں مداخلت کرے۔

اسی بنیاد پر مصر اور دوسرے تمام علاقوں میں دینی جماعتوں کی اٹھان ہوئی۔ جیسے تصوف وسلوک کے سلسلے قائم ہوئے اور مختلف دینی وفلاحی انجمنیں تشکیل پائیں جنہوں نے اپنے بنیادی طریقہ کار اور اساسی پروگرام میں یہ تحریر کر دیا کہ اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری طرف کچھ ایسی جمعیتیں بھی تھیں جنہیں "پارٹیوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا جیسے نیشنل پارٹی، امت پارٹی، وفد پارٹی اور اس سے زائد دوسری پارٹیاں، دستوری پارٹی وغیرہ ان تمام پارٹیوں پر سیکولر رنگ غالب تھا۔ ان کی نظریاتی فکر اور عملی وتنقیدی پروگرام دین وسیاست کی ایک دوسرے سے دوری پر مبنی تھا۔

یہ تمام پارٹیاں وطنیت کے تنگ دائروں پر ایمان رکھتی تھیں انہوں نے قدیم جاہیت کو زندہ کیا جیسے مصر میں فرعونیت کا احیا کیا گیا، شام میں فینیقی تہذیب کو برسر اقتدار آنے کا موقع ملا اور عراق میں آشوری تہذیب وثقافت کو زندہ کیا گیا۔ جو سیاسی پارٹیاں وطنیت کی کشش سے مسحور نہ ہوئیں انہوں نے قومیت سے محبت اور عشق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ چنانچہ ترکی میں طورانی قومیت سے شیفتگی کا اظہار ہوا، عرب ممالک میں عربی قومیت کی تحریک اٹھی اور عظیم شام میں شامی قومیت کا نعرہ بلند کیا گیا۔

حسن البنا کا یہ فرض تھا کہ وہ گھمسان کی جنگ لڑیں تاکہ دین وسیاست کی تفریق کے یہ

غلط نظریات اپنا دم توڑ دیں جن کی تخم ریزی جہالت اور گمراہی نے کی اور "نام نہاد مہذب سامراج" نے جن کی پاسبانی و دربانی کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہو گئیں اور شاخیں فضا میں پھیل گئیں۔

اس غلط فکر کا مقابلہ صحیح فکر سے کرنا ضروری تھا اسلام کے ذریعہ جو مکمل نظام زندگی ہے، سیاست جس کا اہم حصہ ہے، قرآن و حدیث میں اس کے دلائل موجود ہیں، رسول اکرم کی سیرت اور صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی اسکی شاہد ہیں تیرہ صدیوں بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک امت نے اس مقصد کی خاطر کام کیا۔

امام حسن البناؒ کے اس سلسلہ میں متعدد کلمات ہیں جو تمام اخوان کے پاس محفوظ ہیں۔

اپنے ایک رسالہ میں کہتے ہیں :

"جب تم سے پوچھا جائے کہ تم کس چیز کی دعوت دیتے ہو؟ تو جواب دو کہ ہم اسلام کی دعوت دیتے ہیں جسے محمدؐ اس دنیا میں لائے اور حکومت اس کا ایک حصہ ہے اور آزادی اس کا ایک اہم فریضہ ہے۔

پھر اگر تم سے دوبارہ پوچھا جائے کہ (یہ) تو سیاست ہے! تو کہہ دو کہ یہی اسلام ہے اور ہم اس تفریق کے قائل نہیں ہیں۔"

۱۔ اس بات کا زبردست احساس ہونا چاہیے کہ عالم اسلام کو ہر غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونا چاہیے اور تمام اسلامی علاقوں سے غاصب سامراج کو کھسک جانا چاہیے۔ اس کے لیے تمام قانونی و جائز وسائل استعمال کئے جائیں۔ اس کی ابتداء وطن صغیر مصر اور سوڈان سے ہو۔ وطن عربی کبیر محیط سے خلیج بنگالی تک پھیلا ہوا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وطن عربی کی یہ تحدید امام حسن البناء سے میں نے پہلی بار سنی تھی۔ اس لیے کہ وطن اسلامی بحر ہادی سے بحر اٹلانٹک تک انڈونیشیاء سے مراکش تک پھیلا ہوا ہے۔

اس فہم کی وجہ سے مسلم کی سرحدیں وسیع تر ہوئیں۔ عربی امن کے بجائے مشرق و مغرب

میں پھیلی ہوئی اسلامی امت کا ایک فرد ٹھہرا۔ اس کے دل میں تنگ وطنیت یا متعصب قومیت کا خیال تک نہ آیا جس طرح کہ اس زمانے کی دوسری سیاسی پارٹیوں کی حالت تھی۔

اسی لیے اخوان نے جس ملک کے وہ باشندے تھے یعنی مصر، اس کے مسائل کی طرف پہلے توجہ دی اور وادی نیل کے اتحاد اور ان قومی معاملات کی تائید کی جو مصر و سوڈان سے انگریزوں کے اخلا کے لیے کئے جا رہے تھے۔ اخوان نے اس مقصد کے لیے مصر کے تمام بڑے قصبوں اور شہروں میں کانفرنسیں کیں تا کہ رائے عامہ کو بیدار کیا جائے۔ یہاں میں اس بات کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ طنطا کانفرنس میں حسن البنّا نے جب اس مطالبہ کی تشریح و توضیح کی تو اس وقت میری سمجھ میں یہ مسئلہ آسکا اس سے پہلے میں اسے پوری طرح گرفت میں نہ لے سکا تھا۔

ان کانفرنسوں میں امام شہید اس کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے، وہ ذرائع و وسائل جنہیں اس مقصد کے لیے اختیار کرنا گریز تھا۔ ان کی طرف اشارہ کرتے۔ بین الاقوامی اداروں اور انجمنوں سے اس کا مطالبہ کرتے، عالمی رائے عامہ بیدار کرنے کی کوشش کرنا، غاصب استعمار کی پیداوار اور اس کے سامانوں کی خرید و استعمال سے ہاتھ روک لینا اور انگریزوں کے اقتصادی بائیکاٹ کی اپیل کرنا۔ لوگوں کو اس سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ کرنا اور ہر ہر نفس میں جہاد کی روح پھونکنا۔ تا کہ جئیں تو آزاد قوم کی حیثیت سے اور مریں تو شہید بن کر۔۔۔ یہ وہ فرائض تھے جنہیں حسن البنّا ان کانفرنسوں میں انجام دیتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کانفرنس میں امام شہید نے مقاطعہ کی اہمیت اور اس کے اثرات خوب زور دے کر بیان کئے تھے اور یہ کہ ہم اس ہتھیار کو استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم صابر اور قناعت پسند قوم ہیں۔ انگریزوں کا تجارتی معاشی اور اقتصادی بائیکاٹ کر کے کم پر گزارہ کر سکتے ہیں مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس نقطۂ نظر کی تائید میں بعض قومی مثالیں بھی پیش کی تھیں۔ اور اسلامی قوموں کے قریبی تاریخ کے بعض واقعات سے استشہاد بھی کیا تھا۔

اسی وقت آپ نے فرمایا تھا کہ علامہ ابن حزم کے فتاوی جو کتابوں کی تہ میں دبے

پڑے ہیں۔ قوم کے سامنے لائیں گے کہ مشرک دشمن پورا کا پورا نجس ہے اس کا چھونا جائز ہے نہ اس سے کوئی معاملہ کرنا۔

حسن البنّا نے اس تحریک میں زور پیدا کرنے کی طرف ایک قدم اور بڑھایا۔ انہوں نے اخوان سے خاص طور سے اور وادی نیل کے مسلمانوں سے یہ درخواست کی کہ وہ ہر نماز کی آخری رکعت میں جہری نمازوں میں خاص طور سے دعائے قنوت پڑھا کریں اور صورت حال جب نہایت شدید ہو جائے تو رکوع سے اٹھنے کے بعد قنوت نازلہ پڑھیں تا کہ اللہ ان کی پریشانی کو دور کر دے اور مصائب کی بدلیوں کو چھانٹ دے۔ نبی کریم خود بھی ظالم مشرکین کے خلاف اور کمزور مسلمانوں کے حق میں اپنی نمازوں میں دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اور اس سے زیادہ خطرناک اور پریشان کن صورتحال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آزادی چھین لی جائے اور مسلم علاقوں میں کافر برسر اقتدار رہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون:۸)

"اور عزت تو اللہ، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔"

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (النساء:۱۴۱)

"اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی۔"

امام حسن البنّا نے قنوت کی دعائیں اپنی طرف سے ترتیب دی تھیں جنہیں وہ اور دیگر نمازی پڑھا کرتے تھے ایک صدی گزر گئی لیکن آج بھی دعا مجھے اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں اسے نمازوں میں بکثرت پڑھا کرتا تھا وہ دعا یہ ہے:

اللّٰهم رب العالمين وامان الخائفين و مذل المتكبرين وقاصم الجبارين تقبل دعاءنا واجب نداءنا اللّٰهم انك تعلم ان هولاء الغاصبين من الافجرة قد احتلوا ارضنا وغصبوا حقنا وطغا فى

البلاد فاكثروا فيها الفساد اللّٰهم فردعنا كيدهم وفل حدهم وازل دولتهم واذهب عن ارضك سلطانهم وفدهم من وادهم اوعاونهم اوناصرهم اخذ عزيز مقتدر اللّٰهم ولا تلاع لهم سبيلا على ادمن عبادك المومنين

"اے اللہ! سارے جہاں کے پروردگار، خوفزدہ لوگوں کو امان دینے والے متکبروں کو ذلیل کرنے والے اور جباروں کی طاقت توڑ دینے والے! ہماری دعا قبول کرلے، ہماری فریاد سن لے۔ اے اللہ تو خوب جانتا ہے کہ یہ غاصب انگریز ہماری سرزمین پر قابض ہیں انہوں نے ہمارا حق چھین لیا ہے ملک میں سرکشی کی ہے اور فتنہ وفساد کا بازار گرم کر رکھا ہے اے اللہ تو ان کی چالوں کو ناکام کردے، ان کی طاقت توڑ دے، ان کی حکومت کو زمین بوس کردے اور اپنی سرزمین سے ان کے اقتدار کا خاتمہ کردے اور ان کی، ان کے دوستوں کی، ان کے معاونین کی اور ان کے مددگاروں کی سخت پکڑ کر۔ اے اللہ اپنے کسی مومن بندے پر ان کے غلبہ کا کوئی راستہ نہ چھوڑ۔"

حسن البنا کی اسی محنت وجدوجہد اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ آزادی وطن کا جذبہ کسی مسلم بھائی کے شعور میں ماند نہ پڑا یا اس کی زندگی کے کسی بھی گوشے سے غائب نہ ہوا بلکہ یہ ولولہ اور جذبہ ان کے شعور اور احساس کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ گھروں کی نجی گفتگوؤں میں بھی اور مسجدوں اور مدرسوں میں بھی یہ موضوع بحث بنا رہا۔ خلوت اور جلوت میں آزادی وطن کی تمنائیں کروٹ لیتی رہیں اور ان کے وجود کی تہوں میں یہ جذبہ زندہ و پائندہ تر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ شعلہ جوالہ بن کر اس نے انگریزوں کے استعماری منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کو اس متعصب دینداری سے جتنا خوف تھا اتنا کسی اور طاقت سے نہ تھا۔ انہیں اندیشہ تھا مبادا یہ وطنی لہر اسلامی شعور میں تبدیل ہو جائے اور اپنے راستے کے

سارے خس و خاشاک کو بہالے جائے اور اسے اس بات کی کوئی چنتا نہ ہو کہ وہ موت پر غلبہ پا لے یا موت اس پر اپنے پنجے گاڑ دے۔

بلاشبہ تحریک اسلامی اور اس کے بانی کے یہی وہ دینی عقائدی پہلو تھے جن کی وجہ سے لادین وطن پرست حکومتوں نے سازشوں کا ایک جال بنا اور پوری تحریک کو درگور کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے ثبوت میں برطانوی حکومت کے مصری مستقر "فاید" میں انگریزوں امریکہ اور فرانس کے سفیروں کے ۱۹۴۸ء میں ہونے والے اس اجتماع کو پیش کیا جاسکتا ہے جس نے سعد پارٹی کے صدر نقراشی پاشا کی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اخوان المسلمون کو فوراً غیر قانونی قرار دیا جائے اور اس کی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگادی جائے۔ چنانچہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے اسے بین کر دیا گیا اور مرحلہ وار دوگیر کا وہ دور شروع ہوا کہ وادی نیل کی زمین تھرا گئی۔

اخوانی تربیت کی یہ وہ چند جھلکیاں تھیں جو ان کے اپنے چھوٹے وطن وادی نیل سے متعلق تھیں لیکن اس دوران وہ بڑے اور وسیع عربی وطن اور عالم اسلام کے معاملات و مسائل سے غافل نہ رہے۔

بلاشبہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ قبلہ اول کی بازیافت اور فلسطین کی بازیابی ہے۔ اخوان نے اس مسئلہ کا بروقت نوٹس لیا اور اس کی اہمیت محسوس کی اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا۔ اس کے لیے انہوں نے بیانات دیئے، تقریریں کیں اپنے رسالوں کے خاص نمبر نکالے، اجلاس بلایا کانفرنسیں کیں۔ ہر سال کے ۲ نومبر کی تاریخ کو "معاہدہ بالفور" کے موقع پر جلوس نکالے مظاہروں کا نظم کیا تا کہ رائے عامہ بیدار ہو سکے اور نفس مسئلہ کی اہمیت سے عوام واقف ہو سکیں جس نے تیسری دہائی کے پرانے اخوانی رسالوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔

مسئلہ فلسطین کی نزاکت سے ہر اخوانی کارکن پوری طرح واقف تھا اور اس سلسلے میں اس کے احساسات اس وقت پوری طرح بیدار تھے جبکہ مصر کے عوام اس مسئلہ کی اہمیت سے

کوئی تعلق رکھتے تھے نہ اپنے پڑوس میں زبان پھیلائے یہود کی نظروں کو انہیں احساس تھا۔ یہاں تک کہ مصری حکومت کے صدر سے اس سلسلہ میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ میں مصر کا وزیر اعظم ہوں فلسطین کا نہیں۔"

امام حسن البنّا کے خطبے، فلسطین کے سلسلے میں اس کے لیکچرز، اور اخوانی اخبارات میں ان کے آگ لگا دینے والے مقالات ومضامین... مثال کے طور پر موت کی کاریگری، موت کا فن، چل اے جنت کی ہوا وغیرہ مضامین۔ دلوں کو آنے والے دن کے لیے تیار کر رہے تھے۔ جب وہ دن آ گیا اور جہاد کی منادی ہوئی تو شعور کی یہ بیداری اور تربیت کام آئی اور ہزاروں اخوانی نوجوانوں بلکہ بسا اوقات بوڑھے بھی ارض مقدس میں جہاد کے لیے رضا کاروں کی صف میں شریک ہو گئے اور بہادری و سرفروشی اور شہادت کے وہ زندہ جاوید کارنامے انجام دیئے جنہیں دوسروں سے زیادہ خود یہودی جانتے ہیں۔

مشرق عربی کے لبنان اور شام کے مسائل سے اخوان نے غفلت برتی نہ شمالی افریقہ اور مغرب عربی ٹیونس، الجزائر اور مراکش کے حالات کو نظر انداز کیا۔ اخوان کا مرکز ان لیڈروں اور جنگ آزادی کے سورماؤں کا گھر بنا ہوا تھا۔

دوسرے تمام اسلامی ممالک کی آزادی سے اخوان نے دلچسپی لی مثال کے طور پر انڈونیشیا اور دوسرے ممالک کے مسائل کو اپنے اور ان کی الجھنوں اور پریشانیوں کو اپنی الجھنیں اور پریشانیاں تصور کیں ان کے اندر فکری و دینی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی اور ان سے ہر آن قریب رہے چاہے جسموں اور مملکتوں کے درمیان کتنا ہی فاصلہ ہو۔

اخوان کی تربیت کا دوسرا ستون یہ ہے کہ "اسلامی حکومت" کے قیام کی فرضیت کا احساس کیا جائے اور اس کے وجود کا شعور بیدار کیا جائے کیونکہ یہ ایک شرعی فیصلہ ہے اور ایک قومی وانسانی ضرورت ہے۔

فریضہ اس لیے ہے کہ اللہ نے حاکم ومحکوم دونوں پر واجب کیا ہے کہ اپنے تمام

معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم تسلیم کریں اور جن کے دلوں میں ایمان کی تھوڑی سی رمق بھی موجود ہے انہیں اس سلسلہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

حاکموں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول کافی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ:۴۴)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ:۴۵)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ:۴۷)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔"

زیر حکومت عوام کے لیے اللہ کا یہ فرمان کافی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء:۶۵)

"اے محمدؐ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔"

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (احزاب:۳۶)

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔"

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ

أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (النور:۵۱)

''ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اسلامی حکومت کا قیام قومی و انسانی ضرورت بھی ہے اس لیے کہ خاص طور سے امت مسلمہ نے اور عام طور پر پوری انسانیت نے تمام انسانی فلسفوں اور خودساختہ نظام ہائے حیات کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ لیکن اسے وہ سعادت حاصل نہ ہوسکی جس کی اسے توقع تھی، وہ پاکیزگی میسر نہ آسکی جو اس کی تمام سرگرمیوں کا محور تھی بلکہ اس کے برعکس ہر طرح کی ناکامی و نامرادی اس کے دامن میں آئی۔ فرد نے اپنا اطمینان وسکون کھودیا، خاندان اور گھرانے استحکام اور باہمی ربط سے محروم ہو گئے پوری سوسائٹی کا اعتدال و توازن افراط وتفریط کا شکار ہو گیا اور پوری انسانیت امن و سلامتی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

اب یہ عالم انسانیت کا فرض ہے کہ وہ اپنے مرض کے علاج کے لیے کوئی نیا نسخہ آزمائے۔ یہ نیا نسخہ صرف اسلام ہی ہوسکتا ہے۔ جس میں دنیا و آخرت کے سارے مفادات و مصالح یکجا ہیں، جو جسمانی معاملات اور روحانی مسائل کا بہترین سنگم ہے۔ نفس اور خدا کے حقوق دونوں کی رعایت اس میں موجود ہے، افراد کی آزادی ہے تو جماعت کی مصلحت بھی۔ اور بندوں کے ساتھ خدا کا انصاف بھی ہے اور مخلوق کی اصلاح کے لیے خالق کے قوانین بھی۔

امام حسن البناؒ نے اس بنیادی مفہوم کو اپنے تمام رسائل اور تقریروں میں زور دے کر بیان کیا۔ قرآنی حکومت اور اسلامی مملکت کے قیام کا پرزور مطالبہ کیا، اس بدذات سیکولرزم سے جنگ کی جس نے حکومت، قانون، تعلیم اور نشر و اشاعت کے تمام میدانوں میں دین و مذہب کو نظام سلطنت سے بے دخل کر دیا تھا۔ اگر عیسائیت میں ''جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے خدا کو دو'' کا اصول کارفرما ہو تو اسلام میں اس کی گنجائش ہرگز نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اسلام زندگی

کی تقسیم اور انسانوں کے تمام احوال میں بندر بانٹ کے اصول کا قائل نہیں ہے بلکہ قیصر اور قیصر کے سارے حقوق پوری زندگی اور پورے انسان کو خدائے واحد کے لیے خالص سمجھتا ہے جس میں کسی کا کوئی اشتراک نہیں ہے۔

امام شہید اپنے رسالے میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اسلامی حکومت سے ہماری مراد ایسی حکومت ہے جو قوم کو مسجد کا راستہ دکھائے اور اس کے ذریعہ دوسرے لوگوں کو اسلام پر آمادہ کرے جس طرح اس سے پہلے ابوبکرؓ و عمرؓ اور دیگر صحابہ کرام کے ذریعہ اس ہدایت کو دوسروں تک پہنچا دیا تھا۔ اسی لیے ہم کسی ایسے نظام حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جو اسلام کی بنیاد پر قائم نہ ہو اور اس سے روشنی حاصل نہ کرے۔ ہم ان سیاسی پارٹیوں کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور ان تقلیدی رسوم و عادات پر ہم مطمئن ہیں جن کی حکومت اور ان پر عملدآمد پر ہمیں اہل کفر اور دشمنان اسلام نے مجبور کر رکھا ہے ہم نظام اسلامی کے تمام مظاہر کے احیاء اور اس کی بنیاد پر اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔"

رسالہ پانچویں کانفرنس میں اس نکتہ کی مزید وضاحت کی ہے۔ انہوں نے حکومت کے بارے میں اخوان کے موقف کے تئیں عوام الناس کے سوالات کا جواب دیا کہتے ہیں :

"کچھ دوسرے لوگ حیران ہیں کہ کیا حکومت و اقتدار بھی اخوان کے پروگرام میں ہے؟ اگر ہے تو اس کے لیے وسائل کیا ہوں گے؟ میں ان لوگوں کو بھی حیران نہیں رہنے دوں گا۔ نہ جواب دینے سے کسی گریز یا بخل سے کام لوں گا۔ انہیں جاننا چاہیے کہ اخوان تو اپنی تمام تر سرگرمیوں ساری آرزوؤں اور تمام اقدامات میں اپنے وسیع تصور دین کے تابع ہیں اور آغاز گفتگو میں ہم اس تصور دین کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔ یہ اسلام جس پر اخوان کا ایمان ہے حکومت کو اپنا ایک اہم رکن قرار دیتے ہیں۔ وہ جس

طرح ہدایت و ارشاد سے کام لیتا ہے اسی طرح وہ زور و قوت کا بھی استعمال کرتا ہے چنانچہ خلیفہ سومؓ نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ لَيَزَعُ بِالسُّلطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرآنِ

"اللہ تعالیٰ اقتدار کے ذریعہ وہ باتیں روک دیتا ہے جو قرآن کے ذریعہ نہیں روکتا۔"

اور نبیؐ نے تو حکومت کو قصر اسلام کا ایک ستون قرار دیا ہے فقہاء نے بھی حکومت کا شمار عقائد و اصول میں کیا ہے نہ کہ فروعات میں۔ پس اسلام جس طرح تشریع و تعلیم ہے، قانون و قضا ہے، اسی طرح وہ حکومت اور تنفیذ بھی ہے۔ ان میں سے کوئی دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا کہ ان تمام کا چولی دامن کا ساتھ ہے اب اگر مصلح اسلام بس اتنے پر راضی ہو جاتا ہے کہ وہ مسند ارشاد کو زینت دے، دار الافتاء میں بیٹھ کر فتوے دے خوش الحانی سے تعلیمات دین کی تلاوت کرے، فروع و اصول کی داستان سرائی کرے اور ارباب اقتدار کو چھوڑ دے کہ وہ امت کے لیے ایسے قوانین وضع کریں جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہے اور اپنی قوت تنفیذ کے بل پر اسے مجبور کریں کہ وہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرے تو اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مصلح کی آواز دا بصحرا ہوگی۔ اس کی مثال اس نادان کی سی ہوگی جو کسی راکھ کے ڈھیر میں پھونک مار رہا ہو۔

یہ بات تو قابل فہم ہے کہ ارباب حل و عقد اگر اوامر الٰہی کو تسلیم کر لیں، احکام دین کا نافذ کریں آیات و احادیث کے چرچے کریں تو مصلحین امت وعظ ارشاد پر ہی قناعت کر لیں۔ مگر جب صورت حال اس مختلف ہو، جب اسلامی شریعت عملی دنیا سے بے دخل ہو اور ہر طرف طاغوتی نظام کا دور دورہ ہو تو مصلحین امت کی اقتدار سے بے تعلقی ایک نہایت سنگین جرم ہوگی اور اس جرم کا کوئی کفارہ نہیں سوائے اس کے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور اقتدار کو ان کے ہاتھوں سے چھین لیں جو دین حنیف کے طاعت گزار نہیں بلکہ یہ خود دین حنیف کی فریاد ہے اس طرح اخوان خود اپنے لیے حکومت کے طالب

نہیں اگر امت میں ایسے لوگ مل جائیں جو اس بارگراں کو اٹھانے، اس امانت کو ادا کرنے اور قرآنی اصولوں کے مطابق کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ ان کی فوج و سپاہ اور دست و بازو ہوں گے ورنہ حکومت تو ان کے پروگرام کا جزو ہے اور وہ ان تمام ہاتھوں سے اسے حاصل کریں گے جو احکام الٰہی سے منحرف ہے۔

اسی طرح اخوان کی عقل، بصیرت اور حسن تدبیر سے بعید تر ہے کہ وہ حکومت کے لیے آگے بڑھیں، جبکہ افراد امت کا یہ حال ہو۔ لہٰذا بیچ میں ایسا وقفہ ضروری ہے جس میں اخوانی افکار و نظریات کی اشاعت ہو سکے انہیں زیادہ سے زیادہ فروغ اور غلبہ حاصل ہو سکے اور امت یہ سیکھ سکے کہ کس طرح شخصی مصالح عامہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ بات بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ اخوان کو معاصر حکومتوں میں سے کسی حکومت کے اندر بھی، خواہ موجودہ حکومت ہو یا، سابق حکومت یا دوسری فوجی حکومتیں ہوں کوئی ایسا نظر نہ آیا جو اس بارگراں کو اٹھائے ہو، یا فکر اسلامی کی پشت پناہی کے لیے آمادہ ہو لہٰذا امت کو خبردار رہنا چاہیے اور حکام سے اسلامی حقوق کا مطالبہ کرنا چاہئے اخوان کو بھی اس کے لیے پیہم جدوجہد کرنا چاہیے۔

پھر اخوان پر یہ کیسا زبردست الزام ہے کہ اخوان دعوت کے کسی بھی دور میں کسی حکومت کے پٹھو بن کر رہے ہیں یا کچھ دوسرے مقاصد کے لیے کوشاں رہے یا اپنے اصولوں سے ہٹ کر دوسرے اصولوں پر عمل پیرا رہے ہیں، جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو، انہیں اپنا ذہن صاف کر لینا چاہیے۔ خواہ وہ اخوانی رفقاء ہوں یا دوسرے دینی بھائی۔"

اسی طرح حسن البنّاؒ کے اس پانچویں کانفرنس میں فوجی طاقت اور بغاوت کے سلسلہ میں اخوان کے موقف کی وضاحت کرنا نہیں بھولتے۔ فرماتے ہیں:

"بہت لوگ پریشان ہیں کہ کیا اخوان اپنے مقاصد کے لیے قوت بھی استعمال کریں گے؟ اور کیا وہ مصر کے سیاسی یا اجتماعی نظام کے خلاف بغاوت کے درپے ہیں؟ میں

نہیں چاہتا کہ ان دوستوں کو حیران میں چھوڑ دوں، لہٰذا میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں جسے سننا ہو سن لے۔

جہاں تک قوت کا تعلق ہے تو قوت اسلام کا شعار ہے جو ان کے تمام نظاموں اور سارے کاموں میں نمایاں ہے۔ دیکھو قرآن کریم کتنی وضاحت کے ساتھ للکارتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ۶۰)

"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے، ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کردو۔"

اور نبی کریم کا ارشاد ہے:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ

"طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔"

حتی کہ دعا جو عاجزی و مسکینی کا مظہر ہے، اس میں بھی قوت ایک اسلامی شعار کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم برابر یہ فرماتے اور صحابہ کرام کو بھی اس کی تلقین کرتے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَ قَهْرِ الرِّجَالِ۔

"اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں حسرتوں سے، اور تیری پناہ چاہتا ہوں سستی و بے بسی سے اور تیری پناہ چاہتا ہوں قرض کی زیادتی اور لوگوں کے تسلط سے۔"

دیکھتے ہو! یہاں آپؐ نے ضعف اور ناتوانی کے تمام مظاہر سے پناہ چاہی ہے، حزن وغم سے ارادے میں کمزوری آتی ہے سستی و درماندگی سے نتائج و ثمرات میں کمی آتی ہے بزدلی و بخیلی سے جیب ہلکی ہوتی ہے اور قرض و مغلوبیت سے عزت و کرامت پر آنچ آتی ہے تو جو انسان ایسے دین کا پیرو ہو، کیا وہ ہر چیز میں قوی نہ ہوگا اور کیا ہر طرح کی قوت ہی اس کا شعار نہ ہوگی؟ بلاشبہ اخوان المسلمون طاقتور بنیں گے اور لازماً قوت سے کام لیں گے۔

لیکن اخوان اتنے ظاہر بیں اور سطحی نہیں ہے کہ وہ باتوں کی تہ میں نہ اتریں اور وہ ان نتائج کا اندازہ نہ کریں۔ وہ اس سے کہیں زیادہ دور بیں اور دور اندیش واقع ہوئے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ سب سے بنیادی قوت عقیدہ و ایمان کی قوت ہے۔ پھر وحدت و اجتماعیت کی قوت ہے اور ان دونوں کے بعد جنگی قوت ہے کسی بھی جماعت کو طاقتور کہنا صحیح نہ ہوگا جب تک اسے یہ ساری قوتیں نہ حاصل ہوں اور اگر وہ جنگی قوت استعمال کرتی ہے دراں حالیکہ اس کا شیرازہ منتشر اور نظام درہم برہم ہے، عقیدہ کمزور اور ایمان خوابیدہ ہے تو یقیناً وہ ہلاکت و بربادی سے دوچار ہوگی۔ ثانیاً اسلام نے جو قوت کو اپنا شعار کہا ہے کیا یہ ہدایت کی ہے کہ ہمیشہ قوت ہی استعمال کی جائے چاہے کیسے ہی احوال وظروف ہوں؟ یا اس کے لیے کچھ حدود متعین کئے ہیں، کچھ شرطیں قرار دی ہیں اور کچھ حالات کے ساتھ اسے پابند کیا ہے؟ ثالثاً کیا قوت ہی اولین علاج ہے یا آخری چارہ کار ہے؟ اور کیا انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ استعمال قوت کے مفید و مضر نتائج کے درمیان موازنہ کرے اور ظروف و احوال کا صحیح اندازہ لگائے؟ یا وہ قوت کا استعمال کر گزرے، نتیجہ چاہے کچھ ہو؟ استعمال قوت سے پہلے اخوان ان تمام پہلوؤں پر غور کریں گے اور بغاوت تو قوت کا

شدید ترین انتہائی سنگین مظہر ہے اس کے باب میں تو اخوان اور زیادہ دور بیں اور دور اندیش ہوں گے۔ خصوصاً مصر جیسے وطن میں، جس نے بغاوتوں کا بار بار تجربہ کیا، اور اس کا جو انجام ہوا، وہ سب کو معلوم ہے۔

ان چند تمہیدی کلمات کے بعد میں یہ کہوں گا کہ اخوان المسلمون ضرور قوت کا استعمال کریں گے، مگر اس وقت جبکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوگا اور انہیں یہ پورا اطمینان ہوگا کہ وہ ایمان و یقین اور وحدت و اجتماعیت کی بھی قوت فراہم کر چکے ہیں اور جس وقت یہ قوت استعمال کریں گے وہ انتہائی شریف اور جرات و شجاعت کے پیکر ہوں گے وہ پہلے خبردار کریں گے، پھر انتظار کریں گے پھر نہایت عزت و کرامت کے ساتھ وہ اقدام کریں گے اور اس کے تمام نتائج کا پوری خوش دلی اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کریں گے رہی بغاوت تو اخوان اس طرح کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ نہ اس کا وہ سہارا لیتے ہیں اور نہ اس کی افادیت کے وہ قائل ہیں البتہ وہ تمام ارباب حکومت کو آگاہ کرتے ہیں کہ اگر حالات کا یہی رخ رہا اور اہل حل و عقد نے فوری اصلاح اور بروقت علاج کی فکر نہ کی تو یقیناً بغاوت کے لاوے پھوٹ پڑیں گے اور یہ بغاوت خود حالات کا نتیجہ ہوگی اصلاحی کوششوں اور مفید تدابیر سے لاپرواہی کا ثمرہ ہوگی اخوان اور اس کی سرگرمیوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یقیناً یہ روز افزوں پیچیدگیاں اور یہ حالات کی سنگینی ایک زبردست خطرے کی گھنٹی ہے لہٰذا چارہ گروں کو مستعد ہونا چاہیے۔"

اخوان کی سیاسی تربیت کی تیسری بنیاد "وحدت اسلامی" کی ضرورت و اہمیت کا شعور بیدار ہے اسلامی اتحاد ایک دینی فریضہ ہے اور دنیوی ضرورت بھی۔

دینی فریضہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام مسلمانوں کو "امت واحدہ" بنایا

ہے جس کے تمام افراد ایک گھرانے کی مانند ایک دوسرے کے غم خوار اور غمگسار ہیں۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون :۵۲)

"اور یہ تمہاری امت ایک ہی ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس مجھ سے ڈرو۔"

اسی طرح اسلام نے واجب قرار دیا ہے کہ سارے مسلمان وہ جہاں کہیں بھی رہتے ہوں اور کتنے وسیع و عریض خطے میں پھیلے ہوئے ہوں، ایک امام اور سربراہ کے جھنڈے تلے زندگی بسر کریں وہی امام ان کی طویل و عریض مملکت کا سربراہ اور ان کی وحدت کا نشان ہوگا۔ حتیٰ کہ حضور اکرم e نے فرمایا:

مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً (مسلم)

"جس کی موت اس حال میں ہوئی کہ اس نے کسی امام کی بیعت نہ کی ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

رہی اس اتحاد کی دنیوی ضرورت تو وہ اظہر من الشمس ہے اس لیے کہ اتحاد میں طاقت ہے جبکہ انتشار ضعف و ناتوانی کا دوسرا نام ہے تنہا اینٹ کتنی کمزور ہوتی ہے لیکن دوسری اینٹوں کے ساتھ مل کر وہ کتنی مضبوط و مستحکم عمارت کھڑی کر دیتی ہے جس کو زک پہنچانا یا گرانا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس لیے ہم نے دیکھا کہ امام شہیدؒ وحدت اسلامی کی صدا لگا رہے ہیں اعادۂ خلافت کی جدوجہد کی دعوت دے رہے ہیں اور اخوان کے دل و دماغ میں ان باتوں کو بٹھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں تاکہ نئی نسل کی اسی تصور وحدت کی گود میں پرورش ہو اور بوڑھوں کو اسی حالت میں موت آئے۔

ان کے نزدیک اسلامی تاحاد اور عربی اتحاد میں کوئی فرق نہ تھا اگر اس میں سے ہر ایک کا صحیح مفہوم سمجھا جائے اور اسے اس کی حقیقی جگہ دی جائے۔

"رسالہ پانچویں کانفرنس میں قومی عربی اور اسلامی وحدتوں کے سلسلہ میں حسن البناؒ اسلام کے موقف کی جو بعینہ اخوان کا موقف بھی ہے وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اسلام ایک مسلم کے لیے لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ ملک و وطن کی بہبود کے لیے جد و جہد کرے اس کی خدمت میں فنا ہو جائے، جس قوم میں وہ رہتا ہے اس کے لیے خیر و منقبت کا بڑے سے بڑا ذخیرہ پیش کرے اور اس سلسلہ میں رشتہ و پڑوس کے لحاظ سے قریب تر کو ترجیح دے حتی کہ وہ یہ اجازت نہیں دیتا کہ زکوتیں مسافت قصر سے آگے لے جائی جائیں الا آں کہ کوئی ناگزیر اور اہم ضرورت ہو اور اس کی منشا بھی یہی ہے کہ قریب تر کو ترجیح دی جائے اس طرح ہر مسلم کا یہی فرض ہے کہ وہ جس سرحد پر رہتا ہے اس کی حفاظت کرے۔ جس وطن میں اس نے پرورش پائی ہے اس کی خدمت کرے ایک مسلم سب سے زیادہ وطن دوست اور اہل وطن کے حق میں سب سے زیادہ مفید اور باعث خیر و برکت ہوتا ہے کیونکہ وہ رب العالمین کی طرف سے اس کا پابند ہوتا ہے۔ اخوان بھی بہبود وطن کے سب سے زیادہ آرزومند ہیں وہ قوم کی خدمت میں سب سے زیادہ فنا ہیں وہ اس عزیز و محترم ملک کے لیے ہر قسم کے عز و شرف ہر طرح کی ترقی و سربلندی اور ہر نوع کی سعادت و کامرانی کے متمنی ہیں جب کہ خوش قسمتی سے آج اقوام عالم اسلام کی سربراہی بھی اسے حاصل ہو گئی ہے۔"

"پھر اسلام عرب میں پروان چڑھا اور عرب ہی سے دوسروں تک پہنچا اس کا معزز صحیفہ بھی عربی میں آیا اور قومیں اسی کے نام سے اس زبان پر ایک ہوئیں پھر روایت میں یہ بھی ہے کہ :

اِذَا ذَلَّتِ الْعَرَبُ ذَلَّ الْاِسْلَام

"عرب ذلیل ہوگا تو اسلام بھی ذلیل ہوگا۔"

چنانچہ یہ بات آشکارا ہو کر سامنے بھی آ گئی۔ عرب کے سیاسی اقتدار کا تخت الٹا اور

حکومت عجمیوں اور دیلمیوں وغیرہ کے ہاتھوں میں آئی تو یہ حقیقت بالکل عیاں ہو کر سامنے آ گئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ عرب ہی اسلام کی لیگ اور اس کے پاسبان ہیں یہاں میں یہ بھی واضح کر دوں کہ اخوان کے نزدیک عربیت کا وہی تصور ہے جو حدیث میں مذکور ہے ابن کثیر حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"سن لو، عربیت نام ہے زبان کا، سن لو، عربیت نام ہے زبان کا۔"

"مختصر یہ کہ مجد اسلام کی بازیابی، کلمہ دین کی سربلندی اور حکومت الہیہ کے قیام کے لیے عرب کی وحدت ناگزیر ہے اس طرح ہر مسلم کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ عربی وحدت کو زندہ کرنے، اسے مستحکم اور جاندار بنانے کی جدوجہد کرے۔

رہی اسلامی وحدت تو اس کے سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ اسلام جس طرح عقیدہ و عبادت ہے اسی طرح وہ وطن اور قومیت بھی، چنانچہ اسلام ہی ہمارا وطن اور اسلام ہی ہماری قومیت ہے اس کے علاوہ جتنے نسبی امتیازات ہیں، سب باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات:۱۰)

"مسلم، مسلم کا بھائی ہے۔"

نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ

"مسلم، مسلم کا بھائی ہے۔"

گویا دار السلام میں تمام مسلمان بھائی بھائی ہوں گے ہر ایک کی جان کا یکساں احترام ہوگا امیر و غریب، بادشاہ و گدا میں کوئی امتیاز نہ ہوگا ایک کمتر مسلمان بھی کسی کو امان دے گا تو اس کا لحاظ ہوگا اور اغیار کے مقابلے میں سب ایک ہوں گے۔ یاد رہے اسلام جغرافیائی فرق کو تسلیم نہیں کرتا، نہ نسلی و خونی

امتیازات کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ وہ تمام مسلمانوں کو ایک امت سمجھتا ہے اور تمام اسلامی ممالک کو ایک ہی وطن شمار کرتا ہے۔ خواہ ان کے درمیان کتنے ہی فاصلے ہوں اور بیچ میں کیسی ہی دوریاں حائل ہوں۔ اسی لیے اخوان المسلمون بھی اس وحدت کا احترام کرتے، اس رشتے پر ایمان رکھتے اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور اخوت اسلامی کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ ہر اس خطۂ زمین کو اپنا وطن سمجھتے ہیں جہاں کوئی مسلم رہتا ہو اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھتا ہو۔"

امام حسن البنّاؒ مایوسی و ناامیدی کے شکار مسلمانوں کے اندر امید کی کرن جگاتے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی کوشش محض زیاں کاری اور بوالفضولی ہے جس کا کوئی حاصل نہیں۔ جو لوگ اس طرح کی جدوجہد کرنا چاہیں ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنی قوموں کے لیے جدوجہد کریں اور اپنی دوڑ دھوپ سے صرف اپنے وطن کی خدمت کریں، اس کا نقطۂ نظر رکھنے والوں کو امام شہیدؒ یوں جواب دیتے ہیں :

"یہ قومیں پہلے ہی پراگندہ تھیں۔ ایک ایک چیز میں مختلف تھیں، دین بھی مختلف تھا، زبان بھی مختلف تھی، احساسات و جذبات بھی مختلف تھے، آرزوئیں اور تمنائیں بھی مختلف تھیں خوشی و غم کے پیمانے بھی مختلف تھے۔ اسلام نے آکر ان سب کو ایک کر دیا اور ایک ہی کلمہ طیبہ پر ان کے دلوں کو مجتمع کر دیا وہی اسلام آج بھی اپنی انہی صفات و خصوصیات اور انہیں خطوط و نقوش کے ساتھ موجود ہے تو کوئی فرزند اسلام دعوت اسلامی کا علم اٹھائے اور مسلمانوں میں تجدید و احیائے دین کی جدوجہد کرے تو یہ تمام قومیں اسلام کے گرد مجتمع ہو جائیں گی جس طرح زمانۂ قدیم میں مجتمع ہو گئی تھیں ایک کام جو ماضی میں اسلام نے کر دکھایا کوئی وجہ نہیں کہ آج وہ دوبارہ نہ ہو سکے کہ دوبارہ کوئی کام کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے اور تجربہ اس کے امکان پر شاہد ہے۔"

تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اخوان اپنی خاص قومیت کا احترام کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک مطلوبہ ترقی کی یہی اولین اساس ہے اور وہ اس میں کچھ حرج نہیں سمجھتے کہ ہر انسان اپنے وطن کا ہمدرد ہو اور بحیثیت وطن کے اسے دوسرے ملکوں پر ترجیح دے وہ عربی وحدت کے بھی آرزو مند ہیں کہ ان کے نزدیک وہ ترقی کا دوسرا زینہ ہے۔ پھر وہ اسلامی اتحاد کے لیے بھی کوشاں ہیں کہ وہی پورے وطن اسلامی کا شیرازہ اور تمام ممالک اسلامی کا گلدستہ ہے اس کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ اخوان سارے عالم کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں اور وہ وحدت عالم کے علمبردار ہیں کیوں کہ یہی اسلام کی آخری منزل اور فرمودۂ الٰہی وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین کی عملی تفسیر ہے۔"

"اس تفصیلی وضاحت کے بعد اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی کہ ان وحدتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک دوسرے کو قوت پہنچاتی اور اس کے مقصد کی تکمیل کرتی ہیں اب اگر کچھ لوگ یہ چاہیں کہ خاص قومیت کا نعرہ لگا کر بقیہ وحدتوں کا گلا گھونٹ دیں تو اخوان کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور غالباً ہمارے اور ہمتوں کے درمیان نقطۂ امتیاز بھی یہی ہے۔

"شاید یہ بحث ناتمام رہے گی اگر مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں بھی اخوان کے موقف کی وضاحت نہ کر دی جائے۔ اخوان خلافت کو اسلامی وحدت کا راز اور صحیفہ امت کا شیرازہ سمجھتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ یہ اسلام کا ایک نشان خاص اور اس کا طرۂ امتیاز ہے جس کے بارے میں سنجیدگی سے ہمیں سوچنا ہے کیونکہ دین میں بہت سے احکام براہ راست خلیفہ سے متعلق ہیں جو اس کے بغیر انجام نہیں پا سکتے یہی وجہ ہے کہ نبی e کی تدفین سے پہلے صحابہ کرامؓ کو ان کی فکر ہوئی اور جب تک اس اہم کام سے فارغ اور مطمئن نہ ہو گئے آپ کی تجہیز و تکفین کے روادار نہ ہوئے۔

انتخاب امام پر جو حدیثیں زور دیتی ہیں اور جن روایتوں میں احکام امامت کی تفصیل آئی

ہے انہیں دیکھنے کے بعد اس میں شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ جس دن سے خلافت کی لڑی ٹوٹی ہے اسی دن سے مسلمانوں پر یہ فرض چلا آرہا ہے کہ وہ حصول خلافت کے لیے کمربستہ ہوں اور اس کی نزاکت و اہمیت کو محسوس کریں یہی وجہ ہے کہ اخوان نے حصول خلافت کو اپنے پروگرام میں سرفہرست جگہ دی ہے گرچہ ان کا یہ احساس ہے کہ ابھی اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے ہوں گے اور خلافت کی بازیابی کا جو آخری قدم ہوگا اس سے پہلے بہت سے مرحلے طے کرنے ہوں گے۔"

یہ اخوان کی سیاسی تربیت کے چند نقوش ہیں۔ یہ بالکل ایک نئی قسم کی تربیت ہے جو دوسری سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی تربیت سے بالکل ہی جدا ہے گرچہ ان کے پاس بھی کسی نہ کسی قسم کا تربیتی نظام موجود ہے۔

اخوان کی تربیت خالص اسلامی تربیت ہے کیونکہ انہوں نے تنہا اسلام کی بنیادوں اور خصوصیات نیز اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ تربیت تعمیری اور شعوری ہے جس کی بنیاد عقل و فراست پر ہے۔ نری جذباتیت اور سطحیت پر نہیں، عمل پر اس کا دارومدار ہے محض مسحور کن گفتگو پر نہیں تعمیر و تشکیل پر اس کا انحصار ہے تخریب پر نہیں۔ حق و عدل اور قربانی و خود سپردگی پر اس کی نیو رکھی گئی ہے خواہشات، دنیا پرستی اور اتباع نفس پر نہیں رکھی گئی ہے۔

# فصل (۳)

## تعمیر و ایجابیت

- ☆ اخلاق میں کردار میں اللہ کی برہان
- ☆ عمل کا مفہوم اور اس کے درجے
- ☆ فقہی موشگافیوں سے پرہیز
- ☆ مثبت اقدام کی دس وصیتیں
- ☆ ایجابیت ہے کیا؟
- ☆ قید خانے تربیت گاہوں میں بدل گئے

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق!
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

(اقبالؒ)

## اخلاق میں کردار میں اللہ کی برہان :

جس طرح اخوان کے نزدیک تربیت اسلامی کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں ایمانی یا ربانی پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تربیت کے تمام ہی پہلوؤں پر نظر رکھی جاتی ہے اسی طرح اس کی ایک عام خصوصیت جو بہت نمایاں اور ممتاز ہے اس کا تعمیری وایجابی پہلو ہے۔

بانی تحریک حسن البنا شہیدؒ حقیقت میں اسم بامسمیٰ تھے انہوں نے اپنی پوری زندگی تخریب کے لیے نہیں بلکہ تعمیر کے لیے صرف کی وہ صحیح معنوں میں گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار کے غازی تھے مجرد خیال کے شاخ نازک پر آشیانہ بنانا ان کی عادت نہ تھی بلکہ واقعات وحقائق سے دلچسپی لینا اور زندگی میں واقعیت پسندی کا مظاہرہ کرنا ان کا معمول تھا۔

اسی وجہ سے انہوں نے اپنی پوری طاقت اور اپنے گرد اکٹھا ہونے والے اخوان کی طاقتوں اور صلاحیتوں کی تعمیر وتکوین میں لگایا۔ فضول باتوں بیکار مشغلوں اور طفلانہ حرکتوں سے خود بچنے اور اپنے ساتھیوں کو بچانے کی بھی پوری کوشش کی۔ دوسروں کے عیوب تلاش کرنے سے انہیں کبھی دلچسپی نہ رہی نہ ان کے ساتھی اس عبث کام میں لگے۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا اپنا احتساب نفس دوسروں کے عیوب تلاش کرنے کا موقع نہیں دیتا۔

اسلام کا تقاضا ہے کہ ہر مسلم قول سے پہلے عمل پر توجہ دے۔ وہ گفتگو کرے تو اس لیے کہ اسے اس پر عمل کرنا ہے اسے اپنے اندر استحکام ومضبوطی پیدا کرنی ہے تاکہ وہ اللہ کی اس دھمکی کی زد میں نہ آئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (الصف : ۲،۳)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں"

ایک مسلمان کا عمل مہمل اور بے کار نہیں جاتا بلکہ اللہ کے نزدیک اس کی قدر ہوتی ہے اور عوام اس کی نگاہ میں رکھتے ہیں :

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (التوبہ:۱۰۵)

"اے نبیؐ ان لوگوں سے کہہ دوں کہ تم عمل کرو اور اس کو رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

ایک مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لایعنی کاموں میں الجھے اور گھٹیا کاموں میں اپنے اوقات برباد کرے یا غلط اور بیہودہ باتوں میں دلچسپی لے لغو کام کرے یا دوسروں سے بدخلقی سے پیش آئے اور انہیں تکلیف پہنچائے۔ قرآن میں مومنین کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ :

وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (المومنون:۳)

"اور وہ لغویات سے دور رہتے ہیں۔"

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ (القصص:۵۵)

"اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارکش ہو گئے کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے تم کو سلام ہے ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتے۔"

رحمن کے بندوں کی صفت یہ بتائی گئی:

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (فرقان:۶۳)

"اور جب جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔"

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (فرقان ۷۲)

"اور جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔"

مِنْ حُسْنِ الْإِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ

"جس کا اسلام بہتر ہوتا ہے وہ لایعنی چیزوں کو ترک کر دیتا ہے۔"

علمائے حدیث نے اس روایت کو ان چار بنیادی حدیثوں میں شمار کیا ہے جس پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔

اسلام کی نگاہ میں یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنی زبان اور دل کو گالی گلوچ اور افراد یا چیزوں پر لعنت و ملامت کرنے میں استعمال کرے اس لیے کہ یہ برائیاں اسلامیت کے منافی ہیں ایک مسلمان گالی اور لعنت جیسی قبیح برائیوں میں کیسے پھنس سکتا ہے۔ اسی لیے نبی اکرم کی بکثرت احادیث میں گالی دینے سے منع کیا گیا ہے۔

لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا (حدیث)

"مردوں کو گالی نہ دو وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے۔"

اور دوسری حدیث ہے:

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ (حدیث)

"زمانے کو گالی نہ دو اس لیے کہ اللہ خود زمانہ ہے۔"

لَا تَسُبُّوا الرِّيْحَ فَإِنَّهَا مَأْمُوْرَةٌ (حدیث)

"ہوا کو برا نہ کہو اس لیے کہ وہ خدا کے احکام کی پابند ہے۔"

لَا تَسُبُّوا الْحُمّٰى فَإِنَّهَا كَفَّارَةٌ لِلْخَطَايَا (حدیث)

"بخار کو گالی نہ دو کیونکہ وہ گناہوں کو مٹاتا ہے۔"

لَا تَسُبُّوا الدِّيْكَ فَإِنَّهُ يُوقِظُ لِلصَّلٰوةِ (حدیث)

"مرغ کو گالی نہ دو کیونکہ وہ نماز کے لیے بیدار کرتا ہے۔"

اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ خود شیطان کو گالی دینے سے منع کر دیا گیا جب کہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کھلا ہوا دشمن ہے اور رحمت خداوندی سے بھگایا ہوا معلون ہے۔ نسائی، طبرانی اور حاکم نے کسی صحابی سے روایت کی ہے کہ "میں حضورؐ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا کہ ہمارے اونٹ کو ٹھوکر لگی۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ "کمبخت شیطان" نبیؐ نے مجھے ٹوکا۔ شیطان کو گالی نہ دو ورنہ وہ گھر کی طرح پھیل جائے گا اور کہے گا میں نے اپنی طاقت سے اسے پچھاڑ دیا بلکہ بسم اللہ کہو اس سے وہ حقیر ہو جائے گا ایک مکھی کی طرح۔

شیطان کو گالی دینا محض ایک منفی کام ہے اس سے شیطان کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس حرکت سے وہ خوش ہو گا اور اس کا تکبر دو آتشہ ہو جائے گا۔ شیطان کے لے باعث کلفت و زحمت یہ امر ہے کہ انسان کسی مثبت کام کا رخ کرے جیسے وہ ذکر الٰہی میں مصروف ہو جائے اور "بسم اللہ" کہہ دے اس اقدام سے وہ پژمردہ ہو جائے گا اور مکھی کی طرح کمتر اور حقیر ہو جائے گا۔

اخوان کی تربیت میں حسن البناؒ نے اسلامی مفہوم اور اسی تعمیری و مثبت روح کو دوڑانے کی کوشش کی۔ مختلف موقعوں پر متعدد رسائل کے ذریعہ اس کی رہنمائی کی۔

انہیں سلبیت، خود سپردگی اور بدگوئی سے بچانے کی کوشش کی، کٹ حجتی ہٹ دھرمی اور مناظرانہ بحث و مباحثہ سے انہیں دور رکھنے کی بہت خواہش مند تھے۔ انہوں نے اخوان کے لیے کام کے میدان تلاش کیے تا کہ وہ اپنی طاقتوں کو اس میں لگائیں اور اپنی صلاحیتوں کو اس میں خرچ کریں۔ کام کے یہ میدان کثیر التعداد اور متنوع تھے اور اس کے مستحق تھے کہ ان میں اوقات لگائے جائیں، صلاحیتیں کھپائی جائیں، مسلمانوں کے عزائم ان سے متعلق ہوں اور مجاہدین کی گردنیں اچک اچک کر ان کی طرف نگاہ اٹھائیں۔

## عمل کے مفہوم اور اس کے درجے :

"رسالۃ التعلیم" میں عمل کی حقیقت اور اس کے مراتب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"عمل سے ہماری مراد علم و اخلاص کا ثمرہ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۖ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (التوبہ ۱۰۵)

"اے نبیؐ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسولؐ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

سچے اور مخلص بھائی سے علم کے جو درجے مطلوب ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ وہ اپنی شخصیت کی تعمیر کرے، چنانچہ اس کا جسم توانا ہو، اس کا اخلاق محکم ہو، اس کی فکر پختہ اور متوازن ہو، وہ حصول معاش اور کسب مال پر قادر ہو، اس کا عقیدہ درست اور اس کی عبادتیں بے لوث ہوں، وہ اپنی ترقی کے لیے کوشاں اور اپنے اوقات کا قدرداں ہو، اس کے سارے معاملات منظم ہوں اور اس کا وجود دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد ہو، یہ فرداً فرداً ہمارے ہر بھائی کے فرائض ہیں۔

۲۔ وہ ایک مسلم خاندان کی تشکیل کرے، اس سے آگے بڑھ کر اس کے گھر والوں کے دلوں کو بھی جیت لے۔ وہ خانگی زندگی کے سارے گوشوں میں اسلامی آداب کا پاس و لحاظ رکھنے پر انہیں آمادہ کرے، وہ صالح بیوی کا انتخاب کرنے اور پھر اسے اپنے حقوق و فرائض کے حدود میں ہی رہنے کی انہیں تاکید کرے۔ وہ بیٹوں اور ماتحت خادموں کی عمدہ سے عمدہ تربیت کرنے اور اسلامی اصول و مبادی پر ان کی پرورش کرنے کی تلقین کرے

یہ بھی فرداً فرداً ہمارے ہر بھائی کی ذمہ داریاں ہیں۔

۳۔ وہ معاشرے کی اصلاح کرے، لوگوں میں خیر کی دعوت عام کرے، بدی اور منکرات برسر جنگ ہو، نیکی کی طرف بڑھنے، بھلائی کی تلقین کرے اور خیر کے کاموں میں باہم مسابقت کرنے پر حوصلہ افزائی کرے۔ وہ فکر اسلامی کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرے اور قضائے زندگی کے سارے ہی حصوں کو اسلامی رنگ میں رنگ لینے پر لوگوں کو اکسائے۔ یہ فرداً فرداً ہمارے ہر بھائی کی ذمہ داری ہے اور ایک کارکن تنظیم کی حیثیت سے پوری جماعت کا بھی فرض ہے۔

۴۔ وہ ہر اجنبی... غیر اسلامی... اقتدار سے اپنے وطن کو آزاد کرے، دوسرے کسی بھی سیاسی، روحانی، اقتصادی اقتدار کو اپنی سرزمین میں قدم نہ رکھنے دے۔

۵۔ وہ حکومت کی اصلاح کرے یہاں تک کہ وہ حکومت صحیح معنوں میں اسلامی طرز کی نمائندہ بن جائے اور سچ پوچھو تو یہی وہ ساعت ہوگی جب وہ حکومت امت کے ایک خادم کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکے گی۔ یہ بات بھی سامنے رہے کہ اسلامی حکومت کا قیام اسی وقت ممکن ہے جب اس کے کارندے مسلمان ہوں، فرائض اسلام کی ادائیگی میں مستعد ہوں اور علانیہ معصیت کاری سے کوسوں دور ہوں، نیز وہ حکومت اسلامی احکام اور اسلامی ہدایات کو نافذ کرنے میں ذرا بھی کوتاہ نہ ہو۔ اگرچہ اس وقت حکومت کے لیے اس کی بھی گنجائش ہوگی کہ بوقت ضرورت غیر مسلمین سے بھی تعاون حاصل کرے۔ البتہ انہیں وہ کوئی ایسا عہدہ نہ سونپے گی جس کی بدولت انہیں کچھ عمومی اختیارات حاصل ہو جائیں اور اس سلسلہ میں وہ کوئی بھی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ شکل اسلامی نظام حکومت کے عام ضابطے کے خلاف نہ ہو۔

اس حکومت کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اسے اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہوگا رعایا کے لیے یکسر دلسوزی و شفقت کا پیکر ہوگی، عدل و انصاف اس کا شیوہ ہوگا، عوام کے مال سے اسے

کوئی سروکار نہ ہوگا۔ ٹیکس وغیرہ کچھ تعین میں بھی وہ کبھی حد اعتدال سے آگے نہ بڑھے گی۔

اور اس کا فرض ہوگا کہ وہ امن کو بحال رکھے، قوانین اسلام کا نفاذ کرے، تعلیم کو فروغ دے، قوت کو مستحکم کرے۔ حفظان صحت کا انتظام کرے، رفاہ عام کا خیال رکھے دولت کو بڑھانے اور مال کی حفاظت کرنے کا بندوبست کرے، اخلاق کی بنیادیں استوار کرے اور دعوت اسلامی کو زیادہ سے زیادہ عام کرے۔

اور جب وہ اپنے ان فرائض کی انجام دہی میں لگ جائے گی تو پھر وہ اس بات کی مستحق ہوگی کہ ہماری ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں۔ ہم صحیح معنوں میں اس کے وفادار اور اطاعت کیش ہوں اور جانی، مالی کسی طرح کی بھی مدد دینے سے گریز نہ کریں۔

لیکن اگر اس نے کوتاہی کی تو ہم اسے سمجھائیں گے، متنبہ کریں گے اور اگر اس سے کامیابی نہ ہوئی تو اس کی اطاعت سے الگ ہو جائیں گے ظاہر ہے معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت کا کیا سوال؟

۶۔ وہ امت مسلمہ کی بین الاقوامی حیثیت کو دوبارہ بحال کرائے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس کے علاقوں کو آزاد کرائے، اس کے مجد و شرف کو دوبارہ زندہ کرے، اس کی تہذیب و ثقافت کو نئے سرے سے فروغ دے اور اس کے اندر اتحاد و اتفاق کی روح پھونک دے یہاں تک کہ پوری امت ایک دل آویز وحدت میں تبدیل ہو جائے اور اس طرح خلافت ارضی کا کھویا ہوا تخت و تاج پھر حاصل ہو جائے۔

۷۔ وہ سارے عالم کی معلمی و رہبری کا فرض انجام دے، وہ دعوت اسلامی کو زمین کے چپے چپے میں اس طرح پھیلا دے کہ کہیں شرک کا نام نہ رہ جائے اور ہر جگہ طاعت الٰہی کا جاں نواز منظر نظر آنے لگے اور اللہ تو اپنا نور غالب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ آخری چار فرائض پوری جماعت پر عائد ہوتے ہیں اور بحیثیت رکن جماعت ہمارے ہر بھائی پر بھی عائد ہوتے ہیں کتنی بھاری ذمہ داریاں ہیں یہ اور کتنے اہم کام ہیں یہ ادنیا

ان چیزوں کو ایک خیال خام، ایک خواب پریشاں یا اک واہمہ سمجھتی ہے۔ بلاشبہ ہم کبھی مایوس نہیں ہو سکتے اللہ ہمارا سب سے بڑا سہارا اور سب سے بڑا امید گاہ ہے۔"

## فقہی موشگافیاں :

امام شہیدؒ اخوان کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ وہ جزئیات سے پہلے کلیات کا اہتمام کریں فروع سے قبل بنیادوں کی طرف توجہ دیں اور واقعاتی دنیا اس کے مسائل اور علمی معاملات میں دلچسپی کا بھرپور مظاہرہ کریں لیکن لاطائل اور غیر مفید بحثوں اور کاموں میں الجھنے سے قطعی گریز کریں۔

اسی لیے "بیس اصولوں" میں نویں اصول کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

"کوئی بھی مسئلہ جس سے علمی زندگی میں کبھی واسطہ نہ پڑے اس پر اپنی قوتیں صرف کرنا ایک لایعنی کام ہے، جس سے شریعت نے ہمیں روکا ہے۔ وہ فرضی احکام، جواب تک وقوع پذیر نہ ہوئے، ان کی ساری جزئیات اور شاخ در شاخ تفصیلات اسی حکم کے تحت داخل ہوں۔ قرآن کریم کے جو حقائق ہنوز علم کی دسترس سے باہر ہیں، ان کے سلسلہ کی ساری نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں بھی اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر صحابہ کرام کے درمیان فضیلت کا مسئلہ اور ان کے مابین واقع ہونے والے اختلافات اور کشاکشوں کا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے صحابیت کا شرف ان میں سے ہر ایک کو حاصل ہے اور ہر ایک اپنے حسن نیت کا صلہ پانے والا ہے، کیونکہ تاویل کی دنیا تو بڑی وسیع ہے اور ہر ایک اپنی تاویل کا ہی مکلف ہے۔"

امام شہید وضاحت کرتے ہیں کہ فروعی معاملات میں فقہا کے درمیان اختلافات سے کوئی خطرہ نہیں وہ خود اس دین کی طبیعت کا تقاضا ہیں، زبان کی فطرت اور انسان کا اپنا مزاج اختلافات کا مقاضی ہے۔ البتہ باہمی تعصب، عادات اور چھل کپٹ بڑی خطرناک چیزیں ہیں جن سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے۔ آٹھویں اصول میں کہتے ہیں۔

"فروعی مسائل میں فقہی اختلافات دین میں تفرقہ اندازی کا سبب نہ بنیں اور ان کے نتیجہ میں کسی قسم کی باہمی عداوت یا خصوصیت کا شکار نہ پڑے، ہر مجتہد کے لیے ایک اجر تو یقینی ہے پھر

کیا مضائقہ ہے اگر باہمی اخلاص ومحبت اور حب فی اللہ کی پرسکون اور پر روح پرور فضا میں صاف ستھری علمی تحقیقات کی جائیں اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے حق وصواب کی شاہراہ ڈھونڈ لی جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ چیز بے جا تعصب یا باہمی شکر رنجیوں کی کھڈ میں نہ پہنچا دے۔"

انھیں تعلیمات کی وجہ سے اخوان پر اوقات کی بربادی اور تعصب اور ہٹ دھرمی نہایت گراں گزرتی تھی وہ بیفائدہ کاموں میں دلچسپی لینے ہمیشہ دور رہتے تھے بلکہ ان کاموں میں اپنی قوتیں کھپاتے جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اور جس کے نتیجہ خیز ہونے کی توقع ہوتی تھی۔

## ثبات اقدام کی دس وصیتیں :

امام حسن البناؒ کی "دس وصیتیں" تمام اخوان کے پاس محفوظ ہوں گی۔ ان میں سے ہر وصیت ایجابیت، تعمیر اور عمل رابھارتی اور بیکاری سلبیت اور تخریب سے چوکنا کرتی ہے وہ ان وصیتوں میں کہتے ہیں :

۱۔ حالات جیسے کچھ بھی ہوں اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

۲۔ قرآن کی تلاوت کرو یا اس کا مطالعہ کرو، یا اسے سنو یا اللہ کو یاد کرو اور اپنا کوئی وقت بے فائدہ کاموں میں صرف نہ کرو۔

۳۔ فصیح عربی بولنے کی کوشش کرو اس لیے کہ یہ اسلام کا شعار ہے۔

۴۔ کوئی بھی معاملہ ہو، اس میں زیادہ بحث ومباحثہ سے پرہیز کرو اس لیے کہ اس سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

۵۔ زیادہ نہ ہنسو اس لے کہ جس دل کا تعلق اللہ سے ہو وہ سنجیدہ اور باوقار رہتا ہے۔

۶۔ ٹھٹھا نہ کرو، مجاہد امت کوشش اور محنت کے علاوہ کسی چیز سے واقف نہیں ہوتی۔

۷۔ مخاطب سے اپنی آواز بلند نہ کرو اس میں رعونت پائی جاتی ہے اور مخاطب کو تکلیف ہوتی ہے۔

۸۔ افراد کی غیبت اور اداروں کی زخم کاری سے بچو اور خیر کے سوا کوئی بات نہ ہو۔

۹۔ اپنے جس بھائی سے ملو اس کا مکمل تعارف حاصل کرو۔ گرچہ وہ تم سے اس کا مطالبہ کرے اس لیے ہماری دعوت کی بنیاد محبت اور باہمی تعارف پر ہے۔

۱۰۔ فرائض بہت ہیں اور وقت کم ہے دوسروں کی ان کے اوقات کے صحیح استعمال میں مدد کرو اور اگر تمہیں کوئی کام ہو تو اسے جلد نمٹاؤ۔

## ایجابیت ہے کیا؟

مسلم بھائی کی تربیت میں ایجابیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ انفرادی عبادات کی لذت میں محصور ہو کر نہ رہ جائے ذکر و فکر پر اپنی ساری دوڑ دھوپ کو مرکوز نہ کر لے بلکہ معاشرے کی بیماریوں اور عوام کی مشکلات کی طرف بھی توجہ دے، جس عقائدی انحراف میں لوگ مبتلا ہیں۔ عبادتوں میں جن بدعت و خرافات کا دخل ہے، اخلاق کی جس ابتری اور باہمی روابط کی پراگندگی کا شکار ہیں ان سب کی طرف وہ بھرپور توجہ دے۔ خاموش نہ بیٹھ جائے اس لیے کہ ان ناگفتہ بہ حالات میں خاموش نہ بیٹھ جائے اس لیے کہ ان ناگفتہ بہ حالات میں خاموشی وہی رہ سکتا ہے جس نے حالات کے آگے اپنی ڈگیں ڈال دی ہوں یا جو حسرت و ندامت کا مری ہو یا قنوط و مایوسی کے بحران میں مبتلا ہو یا محض نوحہ خوانی کرنا جس کی فطرت ہو۔ ایسے افراد کی روش یہ ہوتی ہے کہ سوسائٹی کے بگاڑ کو دور کرنے، بدعتیوں کو اتباع رسول کی طرف بلانے منحرفین کو صراط مستقیم پر لانے اور مایوس و شکست خوردہ افراد کے اندر حرکت و عمل کی روح اجاگر کرنے اور بزدلوں اور نامردوں کے اندر بہادری اور جاں فروشی کی بجلی دوڑانے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

مسلم بھائی کی تربیت کا عنصر یہ ہے کہ وہ دعوت پر اپنی پوری توجہ صرف کرے، اسے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لے اپنی ساری دوڑ دھوپ کا مرکز و محور مان لے اور فرد واحد کی ہدایت اس کی نگاہ میں دنیا جہاں کی نعمتوں سے بڑھ کر عزیز ہو وہ یہی سمجھے کہ دعوت انبیاء کرام کا طریقہ رہا ہے خلفائے راشدین نے یہی ذمہ داری انجام دی ہے اور یہ کہ زندگی کا سب سے پاکیزہ وظیفہ

یہی ہے۔ اسی لیے اخوان کا شعار ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح کرو۔ اور دوسروں کو اس کی دعوت دو اور ان کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (حم السجدۃ: ۳۳)

"اور اس شخص سے بڑھ کر بہترین بات اور کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے نیک کام کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔"

جس دعوت کی بنیاد پر اخوان کی تربیت ہوئی ہے وہ کسی ایک شکل یا کسی متعین طریقہ کار تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر بھائی کا فرض ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں کو دعوت دے اور ان تمام وسائل کو استعمال کر کے جن پر اسے قدرت حاصل ہے اور جن کو وہ مدعو کے لیے موثر سمجھتا ہے۔ تقریر، لیکچر اور گفتگو کو استعمال کر سکتا ہے معمولی بحثیں جو احسن طریق پر ہوں انہیں بھی اپنا سکتا ہے، دلائل میں تصرف سے کام بھی لے سکتا ہے اور ٹھوس ایمانی موقف کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔

ہر مسلم بھائی اپنی فطرت اور ضمیر کے لحاظ سے داعی ہے اپنے قول و عمل سے لوگوں پر اثر ڈال سکتا ہے حتیٰ کہ اخوان کے بعض مزدوروں، کسانوں اور تاجروں نے جب دعوت کا کام اور اس موضوع پر گفتگو کی تو مخاطب نے انہیں جامعہ ازہر یا کسی دوسری یونیورسٹی کا فارغ التحصیل سمجھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر فطری صلاحیت بھی تھی اور مشق و ممارست کا تجربہ بھی تھا، مزید براں مطلوبہ روحانی صفات بھی تھیں اور شجاعت و دلیری سے بھی وہ مالا مال تھے۔

وہ "دس وصیتیں" جن کا پچھلے صفحات میں تذکرہ ہوا ہے، ان میں سے دو وصیتیں صرف وقت کے متعلق ہیں۔

امام شہید کی موثر ترین وہ تحریریں بھی ہیں جو وہ روزنامہ "الاخوان المسلمون" میں "وقت ہی زندگی ہے" کے عنوان کے تحت لکھا کرتے تھے۔ اس کالم میں انہوں نے اس مشہور مثال کے

"وقت سونا ہے" کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھا:

یہ قول ان مادہ پرستوں کی نظر میں تو صحیح ہو سکتا ہے جو ہر چیز کو مادہ کی کسوٹی پر پرکھتے اور اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وقت سونا اور ہر نفیس چیز سے زیادہ مہنگا اور قیمتی ہے۔ سونا کھو جائے تو اس کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن جو وقت گزر جائے اس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔ حقیقت میں وقت ہی زندگی ہے اور کیا زندگی اس وقت کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے جو گود سے گور تک پر مشتمل ہے؟"

حسن البنا شہید نے اپنی ڈائری میں وہ نصیحت نقل کی ہے جو ان کے شیخ نے ان سے اور ان کے بعض اخوانی کارکنوں سے کی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کو تمہارے اوپر مجتمع کر دے گا۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد تمہاری طرف کھنچی چلی آئے گی پس خوب جان لو کہ تمہارے اردگرد اکٹھا ہونے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ تم لوگوں سے پوچھے گا کہ تم نے ان اوقات اچھے کاموں میں رف کئے کہ انہیں ثواب ملے اور تمہیں بھی، یا انہیں بے مصرف اور بے کار کاموں میں لگا دیا کہ وہ بھی پکڑے جائیں اور ان کے ساتھ میں تم بھی۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شہر طنطا میں وطنی آزادی کی بیداری کے لیے ایک بڑا جشن منایا گیا تھا جس کا مقصد انگریزوں کا اخلاء اور وادی نیل کا اتحاد تھا اس موقعہ پر امام البنا نے اس وصیت کو دہرایا تھا۔

## قید خانے تربیت گاہوں میں بدل گئے:

دور شہنشاہیت میں برطانوی حکومت کے مصری مستقر "قاید" میں انگریزوں، امریکیوں، اور فرانسیسیوں کے سفیروں کے مشہور اجتماع کے بعد دسمبر ۱۹۴۸ء میں جب اخوان مسلمون پر پابندی لگ گئی اور اس کے کارکن جیلوں میں ڈال دیئے گئے تو اخوانیوں نے سب سے بڑے جیل خانہ "طور" کو ایک تربیتی کیمپ میں تبدیل کر دیا۔ جہاں عبادات کا پورا اہتمام کیا گیا، تعلیم و

تدریس کے اوقات مقرر کئے گئے، ریاضت اور ورزش کا کلب بنایا گیا۔ فوجی ٹریننگ کے لیے تربیت گاہ بنائی گئی باہمی مشاورت کے لیے پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا یہاں تک کہ ہم ازراہ مذاق کہتے تھے قید خانہ طور اخوانیوں کا ۱۹۴۹ء کے لیے ایک تربیتی کیمپ ہے جس کے مصارف، اقامت وطعام اور دوسری ذمہ داریاں مصری حکومت کے ذمہ ہیں۔

۱۹۵۰ء میں جیل سے نکلنے کے بعد سیدہ زینب میدان میں ایک اخوانی جشن کا اہتمام کیا گیا۔ میں نے اس میں اپنا ایک قصیدہ پڑھا جس میں ان حالات کی یوں تصویر کشی کی :

قالو :الی السبحن، قلنا شعبته فتحت
لیجمعو نا بها فی الله اخوانا
قالوا :الطور، قلنا :طر موتمر
فیه نقری ما یخشاه اعدانا
فهوا لمصلی نزلی فیه اء نفسنا
وهوا المضیف نقوی فیه اء بدانا
معسکر صاغنا حندا المحرکته
و معهد زاد نا بالحق عر فانا
من حرموا الجمع منافوق اربعته
ضموالا لوف بغاب الطور اسدانا
راموه منفی و تضییقاً فکان لنا
بنعمته الحب والا یمان بستا نا
هذا هوالطور شاء واان نذوب به
وشاء ربك ان نز داد ایمانا

"ان دشمنوں نے کہا قید کی طرف چلو ہم نے کہا، ہمارے لیے ایک شعبہ کھولا گیا ہے

تاکہ ہمارے تمام دینی بھائی اکٹھا ہو جائیں۔"

انہوں نے کہا طور میں چلو، ہم نے کہا یہ ہمارے کانفرنس ہے جس میں وہ فیصلے کریں گے جن سے ہمارے دشمن ڈرتے ہیں۔

یہ ہماری سجدہ گاہ ہے جس میں ہم اپنی تربیت کرتے ہیں، یہ ہمارا میدان ہے جہاں اپنے جسموں کو ہم طاقتور بنائیں گے!

فوجی تربیت گاہ ہے جس نے ہمیں فوجی بنا دیا ہے، ادارہ ہے جس سے ہمارے علم و معرفت میں اضافہ ہوا ہے۔

جنہوں نے ہم میں سے چار آدمیوں کی مجلس پر پابندی لگا دی تھی انہوں نے یہاں طور کی جھاڑی میں ہزاروں شیر جمع کر دیئے ہیں۔

انہوں نے ہمیں پریشان کرنے کے لیے جیلوں میں بند کر دیا ہے لیکن ایمان اور محبت کی برکت سے یہ ہمارے لیے گلزار بن گئے ہیں۔

طور میں بند کر کے انہوں نے ہمیں پگھلانا چاہا، لیکن تیرے رب کی مشیت تو یہ تھی کہ ہمارے ایمان میں اضافہ ہو!"

چنانچہ انقلاب کے جلادوں نے اخوان کے اس تجربہ سے فائدہ اٹھایا اور چوکنا ہو گئے انہوں نے اپنی پوری کوشش کی کہ اخوان جیلوں میں اور قید خانوں میں اپنی دعوت یا اپنے آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکیں، باقی ماندہ اوقات کو ان مفید و بار آور چیزوں میں استعمال نہ کیا جا سکے۔ ۱۹۵۴ء میں جب دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی تو انہیں اب کی بار کوٹھڑیوں میں منتقل کیا گیا جو شب و روز میں صرف کھانا اور پانی پہنچانے کے لیے کھولے جاتے تھے۔ جہاں عذاب کے کوڑے پیٹھوں پر برستے تھے اور کسی بھی اجتماعیت کی اجازت نہ تھی حتیٰ کہ نماز کے لیے بھی اخوان اکٹھا نہ ہو سکتے تھے۔ البتہ فوجی بنا لینے کا مزہ چکھانے کے لیے ہر اجتماعیت اور گروپ بندی کی کھلی اجازت تھی۔ انہیں کوئی کتاب اپنے ساتھ رکھنے کی رخصت نہ تھی حتیٰ کہ قرآن پاک بھی۔

اس کے باوجود یہ قید خانے ذکر و تسبیح اور پر سکون باہمی مطالعہ کے حلقوں میں تبدیل ہو جاتے جب بھی ایذا و تعذیب کے کوڑے خاموش ہوتے۔

ہمارے بعض بھائی "محاربق" کے فوجی کیمپ میں منتقل کر دیئے گئے تا کہ انہیں ایذا و تعذیب کے سخت ترین مرحلوں سے گزارا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں حیرت تھی کہ خشک و چٹیل سرزمینوں سے انہیں اتنی جلدی "دینوی جنت" میں کیسے منتقل کر دیا گیا جہاں باغات تھے، ہری بھری کھیتیاں تھیں، لذیذ میوے تھے، چڑیوں کی چہکار تھی، جن سے پولیس، فوج اور ارد گرد کے رہنے والے تمام افراد مستفید و محظوظ ہوتے۔ لیکن جب انقلاب کے بعض علمبرداروں نے اس جیل کا معائنہ کیا اور ان کے ساتھ مشہور جلاد حمزہ بسیونی بھی تھا تو انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس نے انہیں متحیر کر دیا اور وہ سخت غضبناک ہوئے کہ عذاب کے مارے ان اخوانیوں کے پاس اب بھی کام کے لیے آمادہ سینے اور جذبہ ہیں پیداوار کے لیے بے چین عزائم اور ارادے ہیں چنانچہ انہوں نے ان تمام سہولتوں کو ختم کرنے اور ان کو ملیامیٹ کرنے کا حکم دیا اور ایک ایسی جیل بنانے کے احکام صادر کئے جہاں آدمی کو قوت عمل مفلوج ہو کر رہ جائے۔

حسن البنا کی دوڑ دھوپ اور حرکت و عمل کا نتیجہ تھا کہ ان کی دعوت عمل و تعمیر اور پیداوار کے لیے تھی۔

انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ محض فلسفیانہ یا اکیڈمک قسم کی تحریک بن کر نہ رہ جائے جو بلند و بالا محلوں میں بیٹھ کر "جمہوریہ افلاطون" جیسے کسی مثالی جمہوریہ کا تخیل پیش کرے یا "شہر فارابی" کی طرح کسی عالم و فاضل شہر کا خیالی خاکہ پیش کرے، گرچہ تحریک کی دعوت میں علم و فکر کو شایان شان اہمیت اور مقام حاصل ہے۔

انہوں نے یہ چاہا کہ ان کی جماعت جدل و مناظرہ میں الجھ کر رہ جائے اور اس کے افراد کو "بازنطینی مباحثے اور مناظرے" تباہ و برباد کر دیں جو آج بعض دینی جماعتوں پر چھائے ہوئے ہیں اور جن میں قومیں اس وقت الجھی ہیں ان کے اندر انتشار اور کمزوری کے آثار آنے

گئے ہیں۔ حسن البنا شہیدؒ بے کار مباحثوں اور لاحاصل مناظروں سے بکثرت روکتے تھے اور اس حدیث کو بار بار دہراتے تھے :

"کوئی قوم ہدایت کے بعد گمراہ نہیں ہوئی جب تک وہ اس پر باقی رہتی ہے البتہ جدل ومباحثہ والے اسے راہ راست سے بھٹکا دیتے ہیں۔"

فصل (۴)

# اعتدال وتوازن

جماعت وسط

پتھر بھی شیشہ بھی

سنت بھی تصوف بھی

عقل بھی جذبات بھی

تعلقات میں اعتدال

قومی وطنی تحریکوں کے سلسلے میں دعوت کا موقف

دعوت کے سلسلے میں لوگوں کا موقف

اسلام افراط و تفریط سے پاک معتدل و متوازن تربیت کا انتظام کرتا ہے وہ نہ ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے اور نہ غلو فی الدنیا کی، وہ دین و دنیا کی تفریق کو ایک شیطانی نظریہ قرار دیتا ہے خواہ یہ دنیا کے نام پر پیش کیا جائے خواہ مذہب کے نام پر، نہ اسلام میں سیکولرازم کے لیے گنجائش ہے اور نہ رہبانیت کے لیے بلکہ

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای!
باز می خواہی کہ دامن تر مکن ہشیار باش[1]
اکبر الہ آبادی

---

[1] دریا کی منجدھار میں مجھے تختے پر باندھ کر چھوڑ دیا ہے اور پھر کہتے ہو کہ ہوشیار رہو دامن تر نہ ہونے پائے۔

## جماعت وسط :

تربیت اسلامی کی ایک اہم خصوصیت، جس کی طرف حسن البناؒ نے لوگوں کو بلایا اور اپنے آدمیوں کو اس کی تعلیم دی، اعتدال ہے جسے آپ توازن اور وسطیت بھی کہہ سکتے ہیں۔

جس طرح مسلمان دوسری اقوام اور ملتوں کے درمیان امت وسط ہیں اور اہل سنت دوسرے تمام فرقوں کے مابین درمیانی فرقہ ہیں اسی طرح اخوان تمام اسلامی جماعتوں کے درمیان جماعت وسط ہیں۔

وہ عقل اور جذبات، مادہ اور روح، نظریہ اور عمل، فرد اور معاشرہ، شوریٰ اور اطاعت امر حقوق اور واجبات اور جدید اور قدیم کے درمیان توازن قائم رکھتے ہیں۔

اس تحریک نے پوری اسلامی ورثہ سے استفادہ کیا ہے علمائے شریعت سے نصوص و احکام کا خیال کرنا سیکھا ہے، علمائے کرام سے عقلی دلائل اور شکوک وشبہات کو دور کرنے کے طریقے اخذ کئے ہیں، اور ارباب تصوف سے دلوں کی تربیت اور نفوس کے تزکیہ کے لیے رجوع کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ ان تمام بدعتوں، ملاوٹوں اور انحرافات سے اپنا دامن بچا سکے جو اس اسلامی ورثہ میں داخل کر دیئے گئے ہیں نیز وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے چشمہ صافی سے براہ راست استفادہ کر سکے۔

امام حسن البناؒ نے فقہی ورثہ کا نہ تو بالکلیہ انکار کیا، جیسا کہ کچھ لوگوں کا شیوہ ہے۔ اسی طرح مذاہب اربعہ کی تقلید کو واجب قرار دیا نہ اسے ہر شخص پر حرام ٹھہرایا۔ بلکہ بعض قیود و شرائط کے ساتھ جو اعتدال و توازن پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے اس کو جائز کر دیا۔

"بیس اصولوں" کے ساتویں اصول کی تشریح وہ یوں کرتے ہیں۔

"اگر کوئی مسلمان اپنے اندر اس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ شریعت کے فروعی احکام اور ان کے دلائل کے سلسلہ میں کچھ غور و تحقیق سے کام لے سکے تو اس کے لیے بہتر ہے

کہ وہ ائمہ سلف میں سے کسی امام کی پیروی کرے پھر اس کے بعد جہاں تک ہو سکے دلائل کی چھان بین کرے نہ کوئی بھی قابل اعتماد شخص جس کی صلاحیتوں پر اسے پورا اطمینان ہو، اگر دلائل کے ساتھ اسے کوئی صحیح راہ سمجھائے تو شوق کے قدموں سے اس کی طرف لپک پڑے۔ لیکن اگر وہ ہے تو اہل علم میں سے لیکن اپنے اندر غور و تحقیق کی یہ اہلیت نہیں رکھتا تو اس کے لیے مناسب ہوگا کہ اپنے اس نقص کی تلافی کرے۔"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی امام نے جو کچھ کہہ دیا وہی حق و ثواب ہے بلکہ وہ تو مجتہد ہوتا ہے اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملے گا اور اگر اس سے غلطی ہو گئی تو ایک اجر ملے گا۔ اگر اس کی غلطی واضح ہو جائے تو ہمارے اوپر واجب ہی نہیں بلکہ ہمارے لیے مناسب بھی نہیں ہے کہ اس کی اتباع کریں۔ اسی لیے امام شہید نے چھٹے اصول میں کہا ہے کہ :

رسول معصوم کی ہی ذات گرامی ایسی ہے جن کی ہر بات ہمارے لیے واجب الاتباع ہے، ورنہ اور لوگوں کے سلسلے میں ہمیں اختیار ہے، ان کی جو باتیں مناسب سمجھیں مان لیں اور جنہیں چاہیں ترک کر دیں، ہمارے بزرگ اسلاف سے جتنی باتیں منقول ہیں، ان میں سے جو کتاب و سنت کے مطابق ہوں گی انہیں ہم قبول کریں گے، ورنہ اختلاف کی صورت میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ زیادہ سزاوار ہیں کہ ان کی اتباع کی جائے البتہ ان شخصیتوں کے سلسلے میں ہم ذرا بھی زبان نہ کھولیں گے، ہم انہیں ان کی نیتوں کے حوالے کر دیں گے کہ وہ تو اپنے اعمال سے جا ملے۔"

یہی اعتدال کا موقف ہے یہی وہ درمیانی راستہ ہے جس میں کسی بحث و جدال کا امکان نہیں ہے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب رفع الملام عن الائمۃ الاعلام میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔

تحریک اسلام کے اس دیدبان نے اس پر بس نہ کیا بلکہ اس نے یہ اعلان کیا کہ تمام آراء اور اپنے زمانے کے رنگ میں رنگے ہوئے تمام علوم ہمارے لیے واجب الاتباع نہیں ہیں

ہم چودویں صدی ہجری کے داعیان اسلام ہیں اور ہمیں بھی اجتہاد کا حق اسی طرح حاصل ہے کہ جس طرح انہیں حاصل تھا لیکن ہم ان قدیم علوم اور آراء کو مہمل نہیں کہہ سکتے اور ان کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتے اس لیے کہ بلاشبہ وہ ایک عظیم دولت ہے۔

وہ رسالہ "پانچویں کانفرنس" میں کہتے ہیں :

"اخوان المسلمون کا عقیدہ ہے کہ اسلام کی اساس اور دین کا سرچشمہ اللہ کی کتاب اور نبی کی سنت ہے جن کو اگر امت مضبوط تھامے رہی، تو وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتی۔ بہت سے افکار و علوم جو اسلام سے وابستہ ہو گئے ہیں اور اسی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ان افکار و علوم پر انبیاء اپنے ادوار کی بھی چھاپ ہے اور ان اقوام سے بھی وہ متاثر ہیں جن کے زمانے کی وہ پیداوار ہیں لہٰذا ناگزیر ہے کہ وہ اسلامی نظام جس پر امت کو لے چلنا ہے وہ صاف شفاف چشمے سے سیراب ہو۔ ہم اسلام کو اس طرح سمجھیں جس طرح ہمارے صالح اسلاف سمجھتے تھے، ہم ان ہی رہا مخلوط اور بے حدود پر ٹھہرا جائیں، خود کو ان چیزوں کا پابند نہ کریں جن کا پابند خدا نے نہیں کیا ہے نہ اپنے زمانے پر کوئی ایسا رنگ چڑھائیں جو اس کے لیے ناموزوں ہو کہ اسلام تو ساری انسانیت کا دین ہے۔"

سچی تجدید اور اعتدال و توازن کی روح یہی ہے تجدد اور تصرف کی نہیں۔ اسی طرح فقہ، اجتہاد اور تقلید کے بارے میں نیز مذہبیت اور لامذہبیت کے درمیان اس کا موقف درمیانی اور معتدل ہے، نہ تو غلو ہے نہ تفریط ہے۔

اسی عقیدہ اور اس کے بعض اختلافی مسائل، بعض نصوص کو سمجھنے اور اس میں مذاہب اور فرقوں کے اختلاف کے بارے میں اخوان کا موقف غایت درجہ معتدل اور متوازن ہے۔

## پتھر بھی شیشہ بھی :

امام حسن البناؒ کا عقیدہ وہی تھا جو اہل السنت والجماعۃ کا ہے۔ وہ صفات خداوندی سے متعلق آیات و احادیث کے سمجھنے میں اسلاف کے طریقے پر عامل تھے توحید کی پوری قوت سے ثابت

کرتے تھے اور شرک کی چھوٹی بڑی، ظاہری و مخفی تمام ہی قسموں سے علی الاعلان جنگ کرتے تھے۔ بت پرستی کے تمام ہی مظاہر سے انہیں نفرت تھی اور ان تمام مشرکانہ بدعتوں کے دشمن تھے جنہوں نے مسلمانوں کے عقائد و افکار، عبادات و جذبات اور سلوک و برتاؤ کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا شرکیہ زیارت قبور اولیاء سے مشرکانہ فریاد، کاہنوں اور جوگیوں کے پاس جانا اور ان سے مستقبل کے حالات معلوم کرنا اور دوسری تمام باطل رسموں اور منحرفانہ طریقوں سے انہیں سخت چڑ تھی۔

لیکن شرک و بدعت کے ان علمبرداروں سے اس انداز میں گفتگو کرتے اور ان کے حق میں ایسی فضا بناتے کہ وہ ان کی بات ضرور سنتے تھے۔ امام شہید ان باطل رسموں سے اظہار ناپسندیدگی بڑے حکیمانہ اور محتاط انداز میں کرے جس میں حق کی تلخی اور حکمت و موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت و حلاوت دونوں کا مزہ شامل ہوتا تھا۔

دیکھئے "تین اصولوں" میں وہ کس طرح اپنی بات کہتے ہیں :

"صالحین سے محبت رکھنا ہمیشہ ان کا احترام کرنا اور ان کی جن خوبیوں کا علم ہو، ان کو سراہنا، خدا کی خوشنودی کا ذریعہ ہے، البتہ ہمارے نزدیک صالحین سے مراد وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ (یونس ۶۳)

"جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔"

شرعی حدود و شرائط کے اندر رہتے ہوئے یہ لوگ پوری عزت و تکریم کے مستحق ہیں، البتہ ذہن و دماغ کے کسی گوشہ میں بھی تصور نہ آئے کہ یہ لوگ بھی کسی نفع و نقصان کے مالک ہیں۔ یہ نہ اپنے سلسلے میں کسی قسم کا اختیار رکھتے ہیں، نہ دوسروں کے سلسلہ میں نہ زندگی ہی میں کسی طرح کا نفع و نقصان پہنچانے پر یہ قادر ہیں اور نہ موت کے بعد ہی۔ قبروں کی زیارت کرنا سنت ہے اور اس سلسلہ میں ہم کسی بھی تخصیص کے قائل نہیں البتہ زیارت کا انداز وہی ہونا چاہیے جو رسول اللہؐ سے منقول ہے۔ ہاں یہ بھی واضح رہے کہ اہل قبور

سے... خواہ وہ کوئی بھی ہو... کسی طرح کی مدد چاہنا، ان سے فریاد کرنا، اسی طرح قبروں کو پختہ بنانا، ان پر چادریں چڑھانا اور چراغ جلانا، ان سے برکت حاصل کرنا اور خدا کے علاوہ کسی اور نام کی قسم کھانا، مختصر یہ کہ اس طرح کی جتنی بھی بدعات ہیں وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، جن کے خلاف مہم چلانا ہمارا فرض ہے اور ہم ان اعمال کے سلسلہ میں کسی طرح کی تاویل کے بھی روادار نہیں ہیں۔ کہ یہ سب شرک کے دروازے ہیں، اور ان کے سلسلے میں ذرا سی غفلت یا رواداری ہمارے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔"

دیکھئے امام شہیدؒ باطل رسموں کا انکار کرنے سے پہلے حق کی وضاحت کرتے ہیں اور منکر پر اظہار نکیر سے پہلے معروف کی تعریف کرتے ہیں۔ اس طرز عمل سے باطل سے چمٹا ہوا انسان نرم پڑ جاتا ہے اور مربی حکیم اور موافق داعی کی حیثیت سے اس کے دل کے دروازوں کو کھولنے میں مدد ملتی ہے مخالفین کی طرح مخاطب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی نہ دشمنوں اور معاندوں کا طرز عمل اپنانے کی زحمت کرنی پڑتی ہے۔

"صفات خداوندی" اور اس کے سلسلے میں علماء کے درمیان اٹھنے والے مباحثوں اور اختلافات کے بارے میں بھی امام البنا کا موقف یہی تھا۔ وہ اختلافات سے دامن بچاتے رہیں اور سیدھے سچے عقائد سے رجوع کرتے ہیں۔ دسویں اصول میں کہتے ہیں :

"خدائے تعالیٰ کو ایک ماننا، اسکی صفات کا صحیح ادراک کرنا اور سارے عیوب و نقائص سے اسے پاک جاننا عقیدہ اسلامی کی جان ہے۔ قرآن پاک کی وہ متشابہ آیات اور رسول خدا کی وہ صحیح احادیث جن کے اندر حق تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہے ہم ان کو ہو بہو تسلیم کرتے اور ان پر کامل ایمان رکھتے ہیں ان کے سلسلہ میں تشبیہ (اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے مشابہ قرار دینا) و تعطیل (اللہ تعالیٰ کو صفات سے مجرد عاری ماننا) کے ہم سخت مخالف ہیں۔ اس سلسلہ میں علماء کے جو اختلافات ہیں ان سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں، ہمارے لیے تو اس موقع پر وہی رویہ بس ہے جو رسول خدا اور آپ کے پاک

اصحاب کا تھا۔

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (آل عمران: ۷)

"جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔"

## سنت بھی تصوف بھی :

اعتدال وانصاف اور توازن کا یہی موقف آپ نے تصوف کے سلسلے میں بھی اختیار کیا۔ اس کے خطا وصواب سنگریزوں اور موتیوں سب کو آنکھ بند کر کے قبول کیا نہ سارے ہی صحیح وغلط، خراب وٹیک پہلوؤں کو یکسر ٹھکرایا بلکہ یہاں بھی آپ کا طریقہ یہی رہا کہ جو صاف وشفاف ہو اسے لو اور جو گدلا ہوا سے چھوڑ دو۔ اس لیے کہ تصوف کا سارا ذخیرہ یکسر باطل ہے نہ حق، اسی طرح تصوف کے سارے علماء بدعتی ہیں نہ سب کے سب سنت کے طریقے پر ہیں بلکہ حق وصواب اور خطا وباطل دونوں کی اس میں آمیزش ہے ضرورت ہے کہ دونوں کو الگ الگ کر دیا جائے اور صحیح اور مفید ذخیرے کو اختیار کیا جائے اور باطل کو رد کر دیا جائے۔ تصوف میں جو حرارت و تاثیر ہے وہ آج بھی دوسرے علوم میں نہیں ہے اسی طرح ارباب تصوف کی باتوں کا جو وزن ہوتا ہے وہ دوسروں کی باتوں کا نہیں ہوتا۔ تصوف کے سلسلے میں اپنی اپنی رائے انہوں نے اپنی

ڈائری میں لکھی ہے۔[1]

وہ لکھتے ہیں "صوفی ازم علم سلوک و تربیت تک محدود تھا۔۔ اور اگر اپنی اس حد تک قائم رہتا تو اس کے لیے بھی بہتری تھی اور انسانوں کے لیے بھی۔ مگر وہ بعد کے دور میں اپنے حدود سے تجاوز کر گیا اور ذوق و وجدان کی گتھیوں کو سلجھانے لگ گیا۔ اور اس میں فلسفہ و منطق اور گذشتہ اقوام کے باقی ماندہ افکار و نظریات کی آمیزش ہو گئی اور اس نے دین کے اندر ان باتوں کو گھول دیا جن کا دین سے کوئی واسطہ تھا اور ہر زندیق، ملحد، بگڑا اور بدعقیدہ انسانوں کے سامنے ایسے وسیع مواقع فراہم کر دیئے کہ وہ تصوف کے نام پر زہد و تقشف کی تبلیغ کی آڑ میں اور روحانی جلا حاصل کرنے کے شوق کے پردے میں دین کو مسخ کرنے کا کام کرتا رہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ اس پہلو پر جو تحریری یا روایاتی ذخیرہ تیار ہوا وہ اس قدر ناقابل اعتماد تھا کہ دین حق کا فہم رکھنے والوں اور دین کو صاف شفاف دیکھنے کے خواہشمندوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اسے اپنی باریک بین نگاہ کی سان پر چڑھائیں اور اس میں کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دکھائیں۔ اس کے بعد صوفی ازم کی عملی تشکیلات کا دور آیا چنانچہ صوفیاء کے متعدد فرقے اور سلسلے وجود میں آ گئے اور ہر ایک نے اپنے مخصوص اسلوب تربیت کے تحت اپنا الگ فرقہ تشکیل دے دیا۔ آگے چل کر سیاست نے اس میدان میں دراندازی شروع کر دی اور اس نے صوفیا کی جماعتوں کی ضرورت پیش آنے پر اپنی اغراض کا سہارا بنایا چنانچہ کبھی ان فرقوں کو عسکری پر منظم کیا گیا اور کبھی پرائیویٹ جمیعتوں کی شکل دی گئی اور آخر کار تصوف نے مختلف مراحل عبور کرتے ہوئے وہ عصری تصویر اختیار کر لی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس تصور میں تصوف کی طویل تاریخ میں ابھرنے والے مختلف الوان کے باقی ماندہ نشانات پائے جاتے ہیں اور آج مصر کے اندر اس نظریے کی نمائندگی مختلف سلسلہ ہائے طریقت کے شیوخ اور ان کے مریدوں اور ہمنواؤں کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ اس امر کی کوئی شبہ نہیں ہے کہ تصوف و طریقت بہت سے ممالک میں اسلام کی اشاعت اور اسلام کو ایسے دور دراز گوشوں تک پہنچانے کا بہت بڑا عامل رہا ہے جہاں صوفیائے کرام کی کوششوں کے بغیر اسلام نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مثلاً افریقہ کے مختلف شہروں اور صحراؤں میں اور وسط افریقہ میں اسلام کا داخلہ اہل تصوف کی بدولت ہی ہوا بلکہ آج تک ہو رہا ہے ایشیا کے بہت سے ممالک میں بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے نیز یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ تربیت و سلوک کے بارے میں تصوف کے قواعد و ضوابط پر عمل درآمد نفس و قلب پر بڑا مضبوط اثر پیدا کرتا ہے۔ اس باب میں صوفیاء کا کلام وہ جولانیاں دکھاتا ہے جو کسی دوسرے انسان کے کلام کو نصیب نہیں۔ لیکن تصوف کے اندر مختلف افکار و نظریات کی آمیزش نے اس کے بیشتر فوائد کو ضائع اور برباد کر دیا۔ مصلحین امت کا فرض ہے کہ ان وقیانہ گروہوں کی اصلاح و تطہیر کے لیے طویل سوچ بچار کریں ان لوگوں کی اصلاح نہایت سہل اور آسان ہے۔ ان کے اندر اصلاح قبول کرنے کی مکمل استعداد موجود ہے بلکہ یہ شاید تمام انسانوں سے زیادہ اصلاح سے نزدیک تر ہوتے ہیں بشرطیکہ ان کو صحیح طور پر اصلاح کی جانب متوجہ کیا جائے۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

باوجود اس کے کہ ابتداء میں انہوں نے کسی طریقت سے تعلق پیدا نہیں کیا لیکن اپنی باگ ڈور کبھی اس کے حوالے نہ کی۔ بلکہ اس سے استفادہ کیا تو بہت کچھ چھوڑا بھی۔ انہوں نے اپنے بارے میں اور اپنے دوست السکری کے بارے میں لکھا ہے کہ "ہم مرید تھے لیکن فکر و نظر میں آزاد تھے گرچہ اپنی سمجھ کے مطابق عبادت ذکر اور آداب سلوک کے سلسلہ میں ہمارے اندر مکمل اخلاص تھا۔"

پھر ان کی طریقت دوسری تمام بدعتوں سے بہت دور تھی اور شیخ طریقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شدت برتتا تھا حتی کہ بادشاہوں اور امراء کو ان کی غلط روش ٹوک دیتا تھا سنت سے اس کی محبت اور بدعات اور خرافات سے اس کی جنگ نہایت سخت تھی اور وہ شیخ کی کرامات اور اس کی خوارق عادات پر زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ ان کی نظر میں طریقت کا استعمال مخلوق خدا کی ہدایت اور حق کی نشر و اشاعت کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ کرامات کا ظہور کے لیے۔

حسن البنا شہید نے ان تمام بدعتوں اور خرافات کے استیصال میں ذرا بھی نرمی نہ دکھائی

---

بقیہ

اس کام کو سرانجام دینے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ کچھ صالح و باعمل اور مخلص و صادق مبلغین دوسرے ہر کام سے فارغ ہو کر صرف ان گروہوں کے حالات کا جائزہ لیں اور تصوف کے علمی ذخیرے سے استفادہ کریں اور جو خرابیاں اس میں شامل ہو چکی ہیں انہیں صاف کریں اور اس کے بعد اس کو چپکے راہ خوردوں کی صالح قیادت کا انتظام کریں۔ (حسن البنا کی ڈائری صفحہ ۱۲۶، ۱۲۸)

امام شہید کی ابتدائی عمر میں تصوف سے دلچسپی کی وجہ تھی کہ ان کے اکثر اساتذہ تصوف سے دلچسپی رکھتے۔ انفرادی عبادت میں مشغول رہتے، عبادت گزاری، راست بازی تقویٰ اور آداب طریقت کی پابندی کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ چنانچہ حسن البنا خود لکھتے ہیں کہ: "یہ تمام اکابر مجھ جیسے دوسرے نوجوانوں کو مسلسل تھپکی دیتے رہتے کہ ہم اس راستے پر... بندگی خدا کے راستے پر... رواں دواں رہیں۔ یہ تھے وہ محرکات جنہوں نے صوفیانہ مشاغل و مراسم کے ساتھ بڑی دلچسپی پیدا کی اور ان پر مجھے کاربند رکھا۔" (حسن البنا شہید کی ڈائری صفحہ ۱۵۰) (از مترجم)

جو تصوف کے دلدادہ بہت سے افراد کے درمیان رواج پا چکے ہیں، قبروں کو مشرکانہ زیارت، اہل قبور سے تبرک حاصل کرنے اور ان سے دعائیں مانگنا اور گنڈوں اور تعویذوں کا استعمال ان تمام چیزوں کے خلاف سختی سے ڈٹے رہے "بیس اصولوں" میں ان تمام بدعتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا اور انہیں کبائر میں شمار کیا جن کے خلاف جنگ ہونی چاہیے اور ان تمام چور دروازوں کو بند کرنے میں کسی قسم کی تاویل نہ کرنی چاہیے۔

اس کے باوجود بدعت سے نفرت اور اس کے خلاف اعلان جنگ کی تلقین یوں کی :

"ہر وہ بدعت جو محض لوگوں کو ہوا و ہوس کے نتیجے میں دین کے اندر داخل ہو گئی ہو اور شریعت میں اس کی کوئی اصل نہ ہو، وہ گمراہی ہے جس کے خلاف اعلان جنگ کرنا اور بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ہمارا فرض ہے۔ معاملہ کی نزاکت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ بدعت دین میں زیادتی کی راہ سے داخل ہوئی یا کسی کانٹ چھانٹ کے نتیجہ میں، لیکن اس مقصد کے لیے جو وسائل ہم اختیار کریں گے وہ انتہائی دانشمندانہ اور غایت درجہ حکمت و تدبیر پر مبنی ہوں گے کہ کہیں ہمارا یہ اقدام اس سے بھی بڑے شر کا پیش خیمہ نہ ثابت ہو۔"

اور یہی حکمت اور غایت و خوشمندی کا تقاضا بھی ہے اس لیے کہ کسی منکر کے خلاف محاذ قائم کرنے سے اگر اس سے بڑے منکر کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس وقت خاموشی اختیار کرنا ضروری ہے، اس لیے قرآن و سنت میں تفقہ و حکمت کو اصل مانا گیا ہے۔

اس حکمت اور تفقہ کا نتیجہ تھا کہ امام شہیدؒ رمضان میں تراویح کی نماز آٹھ رکعت ہی پڑھتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ سے روایت آتی ہے، لیکن بیس رکعت پڑھنے والوں پر آپ نے کبھی اظہار نکیر نہ کیا اس لیے کہ ہر فریق کے پاس اپنے موقف کی حمایت میں دلائل موجود ہیں اور اختلافات فروعی، معاملات میں برقرار رہیں گے جس کے متعدد اسباب ہیں ان کا تذکرہ وہ اپنے کئی رسائل میں کر چکے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار ایک ایسے شہر میں پہنچے جس کے باشندوں کے درمیان بیس

اور آٹھ رکعتوں کے درمیان اختلاف تھا۔ یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ قریب تھا کہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے لڑ پڑیں۔ جب آپ پہونچے تو انہوں نے آپ سے سوال کر دیا کہ بتاؤ تراویح کی نماز سنت ہے یا فرض؟ سب نے بالاتفاق کہا کہ سنت ہے۔ پھر پوچھا کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اخوت سنت ہے یا فرض؟ سب نے بیک وقت جواب دیا کہ فرض ہے۔ اب امام نے پوری قوت اور وضاحت سے کہا "تم لوگ کس طرح ایک سنت کی خاطر فرض کو منہدم کر رہے ہو؟ تمہارے لیے بہتر ہے کہ آخری چارۂ کار کے طور پر مسجد میں تراویح نماز ادا کرنا چھوڑ دو اور اپنی اخوت اور اتحاد کو باقی رکھو بجائے اس کے کہ نماز مسجد میں پڑھو اور ایک دوسرے کے چہرے نوچو!"

## عقل بھی جذبات بھی :

امام حسن البناؒ کی یہ ایک اہم خصوصیت تھی کہ وہ عقل و قلب کا بہترین امتزاج تھے۔ ایک طرف دلائل کو قبول کرنے والا دماغ رکھتے تھے تو دوسری طرف باذوق دل کے بھی مالک تھے۔ یہی صفت وہ اپنے ساتھیوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ عقائد میں سلفی المسلک تھے توحید پر ایمان رکھتے تھے اور چھوٹی بڑی، ظاہر و مخفی تمام ہی قسموں کے شرک سے نفرت کرتے تھے صفات خداوندی کی آیات اور احادیث کے سلسلے میں وہ سلفی طریقہ کے پیرو تھے جس کی وضاحت انہوں نے اپنے رسالہ "عقائد" اور "بیس اصولوں" میں کی ہے۔

عبادت میں بھی سنت کے متبع تھے، بدعت سے ذرا تعلق نہ تھا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی انسان کو جہنم میں پھینک دیتی ہے۔

لیکن تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق، دلوں کو روحانی امراض کے علاج، خواہشات سے جنگ اور انسان کے دل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شیطانی چالوں کے توڑ کے لیے وہ اسلامی تصوف کو اختیار کرتے ہیں، ایمانی و ربانی طریقت کی حلاوت کا مزہ چکھتے ہیں اور اپنے

پیروکاروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں چنانچہ ارباب تصوف کی کتابوں میں ان کے طریقہ کار سے ایسی چیزوں کا اکتساب کرتے ہیں جو روح کو ترقی دے سکیں قلب کو پاکیزہ کر سکیں، اللہ سے تعلق جوڑ سکیں اور تمام بھائیوں کے درمیان محبت والفت کو استوار کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔

اس سلسلہ میں ان کا موقف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیمؒ کے موقف سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ ان دونوں نے تصوف سے علمی، عملی اور تعلیمی طور پر استفادہ کیا اور متعدد رسائل اور کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان میں تیمیہؒ کے فتویٰ کے دو مجموعے خاصے مشہور ہیں۔ ایک تصوف کے نام سے ہے اور دوسرا "سلوک" کے نام سے۔

ابن قیمؒ کی بھی کئی تالیفات ہیں

الداء والدواء، طریق الهجرتین، عدة الصابرین وذخیرة الشاکرین

ان کی سب سے عظیم تصنیف "مدارج السالکین" ہے جو منازل السائرین کی شرح ہے۔

"المنازل" شیخ الاسلام اسماعیل الهروی کا ایک مختصر رسالہ ہے لیکن ان میں شیخ الاسلام کی اکثر مقامات پر یہ کہہ کر مخالفت کی ہے کہ "شیخ الاسلام ہمیں محبوب ہیں لیکن حق ان سے زیادہ محبوب ہے۔"

ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ربانی مومنوں میں سے تھے دل زندہ کے مالک تھے۔ پاکیزہ نفوس رکھتے تھے، ملاء اعلیٰ تک پہنچی ہوئی روحیں ان کے پہلو میں تھیں، یہاں تک کہ ابن قیمؒ نے اپنے شیخ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا "میرے اوپر کچھ اوقات ایسے آتے ہیں جس کے بارے میں کہتا ہوں کہ اگر اہل جنت اسی حالت میں ہیں جس میں ہوں تو وہ اچھی حالت میں ہوں گے۔

جب انہیں قلعہ میں قید کر دیا گیا تو ان کے عزم وارادہ میں کوئی کمزوری نہ آئی اور مولیٰ سے محبت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اس وقت انہوں نے کہا۔ "محبوس تو وہ ہے جس کو اس کا دل

رب تک رسائی حاصل کرنے سے روک دے اور قیدی وہ ہے جسے اس کی خواہشات قید کرلیں۔"

انہوں نے چیلنج کیا "میرے دشمن میرا کیا بگاڑ لیں گے، اگر انہوں نے مجھے قید کیا تو مجھے خلوت کی نعمت نصیب ہوگی، اگر جلاوطن کر دیا تو سیاحت کا موقع مل جائے گا اور اگر قتل کر دیا تو شہادت کا عظیم مرتبہ میسر آئے گا۔"

حسن البنا کی دعوت، زندگی اور ان کے افکار کا میں نے مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک طرف تو تصوف سے بہت قریب تھے اور دوسری طرف سلفیت کا بھی حد درجہ اہتمام تھا لیکن کبھی ان دونوں نقطہائے نظر کے درمیان جنگ نہ ہونے دی بلکہ سلفیت کی سختی کو روحانی تصوف سے نرم کیا تو دوسری طرف تصوف کو سنت کے التزام کے ذریعہ "پابند گل" بنایا اور یہی چھاپ ان کے تمام پیروکاروں پر رہی۔

## معاشرے سے تعلقات میں اخوان کا اعتدال :

اخوان کی تربیت میں کارفرما اعتدال و توازن کی ایک نمایاں دلیل یہ ہے کہ سوسائٹی اور اس سے اخوان کا تعلق ایک ایسے معتدل اور متوازن طریق کار پر مبنی ہے جو سوسائٹی کو وسیع الاطراف افق، متعدد گوشوں اور پہلوؤں سے دیکھتا ہے جس میں گرد و غبار اور تاریکی کا اشتباہ نہیں رہتا۔

موجودہ سوسائٹی خالص اسلام اور مکمل ایمان کا نمونہ نہیں ہے جیسا کہ بعض سطح بیں حضرات یہ چرچا کرتے پھرتے ہیں کہ امت محمدیہ خیر کے ساتھ وابستہ ہیں بس کمی اگر ہے تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے اس سے تمام گرہیں کھل سکتی ہیں اور مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

بلاشبہ مختلف اسلامی ممالک میں سوسائٹی نہایت خطرناک اور تباہ کن چیزوں میں مبتلا ہے، عقیدہ و فکر اور اخلاق و اجتماعیت کو بہت سی بیماریاں لگ گئی ہیں۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں فساد رونما ہو چکا ہے، عقلوں میں فساد آیا تو عقائد و مفاہیم کی دنیا زیر و زبر ہو گئی ضمیروں میں بگاڑ آیا تو اخلاق و اعمال ویران ہو گئے، قوانین تباہی کا شکار ہوئے تو دستوری و قانونی عمارت متزلزل ہو گئی، خاندان میں فساد پھیلا تو میاں بیوی اور والدین اور بچوں کے درمیان کے رشتے کمزور ہو

گئے اور اجتماعی و اقتصادی اور سیاسی دنیا میں ایسا انتشار اور ایسی پراگندگی آئی کہ مسلمان جو کبھی دنیا کی قیادت کرتے تھے خود دوسروں کی قیامت و رہنمائی کے محتاج بن گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب ضمنی نتائج ہیں جو فہم و اعتقاد اور ایمان و عمل کی دنیا میں صحیح اسلام سے انحراف کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو سوسائٹی کو کسی ایسی نئی دعوت کی ضرورت نہ تھی جو اس کے فہم و اعتقاد کو اسلام کے مطابق کر سکے اور اس کے ایمان کی تجدید کر سکے اور صحیح رہنمائی اور بہترین تربیت کے ذریعہ اسلام کو اچھی طرح نافذ کر سکے۔

سوسائٹی کے اس فساد اور انحراف کے باوجود حسن البناؒ نے ایک دن کے لیے بھی اسے کافر جاہل سوسائٹی نہیں کہا۔

وہ کہتے تھے کہ سوسائٹی میں انحراف ہے، فسق و نافرمانی ہے، بدعت کا چلن ہے لیکن یہ کبھی نہیں کہا کہ پورا معاشرہ کافر اور مرتد ہے۔

کیونکہ اس سوسائٹی میں اسلامی شعائر کے قیام کی کوشش ہوتی رہی ہے اسلام کے بعض احکام نافذ کئے جاتے ہیں، جمہور مسلمانوں کا اپنے رب، اپنے نبی، اور اپنے قرآن پر برابر ایمان رہا ہے ان کے دلوں میں ایمانی جذبات کی انگیٹھی شعلہ زن رہی ہے اور اسلام ہی ان قوموں کی حرکت و عمل کا اولین محرک رہا ہے۔

حسن البناؒ شہید اپنے پیروکاروں کو تکفیر کی غلطی سے بچنے کی پوری تلقین کرتے تھے اور اس فتنہ سے احتراز کی نصیحت کرتے تھے جس میں اس سے پہلے خوارج مبتلا ہوئے، جنہوں نے اپنے علاوہ سارے مسلمانوں کو کافر بنا ڈالا اور ان کی جان و مال کو مباح سمجھ لیا۔ یہاں تک کہ ان کی نمایاں صفت یہ بن گئی کہ وہ اہل اسلام کو قتل کرتے ہیں اور بت پرستوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔"

حسن البناؒ ان دینی جماعتوں پر اظہار نکیر کرتے تھے جو ایک دوسرے پر تکفیر، شرک، اور ارتداد کے فتووں کے تیر چلاتی ہے۔

اپنے "بیس اصولوں" کے آخر میں صراحتاً کہتے ہیں:

"کوئی مسلمان جو کلمہ شہادت کا اقرار کرلے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے سارے فرائض ادا کرے، اس پر کسی گناہ کی یا اس کے کسی نظریہ کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہ لگاؤ۔ الا آنکہ وہ کلمہ کفر صاف صاف زبان سے ادا کرے یا دین کی کسی ثابت شدہ اور مسلمہ حقیقت کا انکار کرے، یا صریح قرآن کی تکذیب کرے یا اس کی کوئی ایسی تفسیر کرے جو اسالیب زبان کی رو سے کسی طرح ممکن نہ ہو، یا کوئی ایسا کام کرے جس کی سوائے کفر کے اور کوئی توجیہہ نہ کی جاسکتی ہو۔

افراد اور جماعتوں کی تکفیر جس کے بعد کے ادوار کی بعض دینی جماعتوں اور افراد نے اپنا شعار بنالیا ایک دینی غلطی تھی، علمی غلطی تھی، اور تحریکی نقطہ نظر سے بھی غلطی تھی امید ہے کہ اس موضوع کو ایک مستقل کتاب میں تفصیل سے انشاء اللہ بیان کروں گا۔

معاشرے میں اخوان کے تعلق کے سلسلے میں بھی یہی معتدل و متوازن نظریہ کام کر رہا ہے۔ "انقلاب" یا "تجدد" کے نام پر انہوں نے معاشرے کے خیر و شر اور حلال و حرام ہر جائز و ناجائز کام یا اقدام میں اس کا ساتھ نہ دیا اور چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ نظریہ کے کبھی قائل نہ رہے ہوا کے رخ پر چلنے اور پانی کے بہاؤ کی طرف بڑھنے کو انہوں نے کبھی صحیح نہ سمجھا جیسا کہ نام نہاد انقلاب کے علمبردار اور تجدد کے داعی مسلمان ممالک میں کر رہے ہیں۔

دوسری طرف سوسائٹی کے افکار، اس پر غالب رہنے اور اس کے ساتھ دشمن کا سا معاملہ کرنے کو بھی حق نہ تصور کیا۔ اسے بلندی سے یا دور رہ کر مخاطب کیا نہ غرور و تکبر اور برتری و بڑائی کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ معاشرے سے الگ تھلگ رہنے اور اپنے آپ کو عوام الناس سے جداگانہ سمجھنے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔

اخوان کی اس تربیت کی بنیاد اس تعلیم پر ہے کہ معاشرے کا خیال رکھا جائے اس کے واقعات و حوادث میں برابر شریک رہا جائے۔ اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا احساس کیا جائے بایں طور کہ مسلم بھائی معاشرے کی مسرتوں میں برابر ساتھ اور جب غم کی بدلیاں چھائیں تو اس کی خوشی بھی کافور ہو جائے اور اس کی خوشی رکھنے، پریشانیوں سے نجات دلانے اور اس کی خرابیوں

کی اصلاح کے لیے برابر دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ کیونکہ اس کی حیثیت جسم کے ایک عضو یا عمارت کی اینٹ کی سی ہے۔

رسول اکرمؐ نے ہمارے سامنے مسلمانوں کے معاشرے کی یہی تصویر کھینچی ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضاً

"ایک مومن دوسرے مومن کے لیے اس عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تقویت پہنچاتا ہے۔"

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ

"مسلمانوں کی باہمی محبت و رحمت کی مثال ایک جسم کی سی ہے۔"

حسن البناؒ اپنے رسالے "ہماری دعوت ایک نئے مرحلے میں" میں لکھتے ہیں:

"ہم سب مصری ہیں، اسی مصر کی خاک سے اگے، یہیں پھلے پھولے اور یہیں پر پروان چڑھے ہیں اور مصر وہ سرزمین ہے جو ایک زمانہ سے ایمان کا مرکز رہی ہے، خوشی خوشی اس نے اسلام کا خیر مقدم کیا ہے، اسے اپنے یہاں بسایا ہے، تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کا دفاع کیا، سیل عدوان کے خطرے سے اسے بچایا ہے پورے اخلاص کے ساتھ اسے اپنایا ہے۔ نیک تمناؤں اور پاکیزہ ارمانوں کے گہوارے میں اس نے پرواز پڑھایا ہے اور اس وقت وہ سنبھل سکتا ہے تو اسلام ہی سے، اس کے روگوں کا علاج اسلام ہے۔ اسلام ہی کا نسخہ کیمیا اسے صحت مند اور توانا بنا سکتا ہے اور اس وقت تو مختلف حالات کے تحت فکر اسلامی کے تحفظ اور اس کی سرپرستی کی بھی ذمہ داری اس کے سر پر آ گئی ہے، تو بھلا ہم مصر اور بہبود مصر کے لیے کیوں نہ کوشاں ہوں گے؟ اپنی قوتوں اور توانائیوں کے ساتھ کیوں نہ اس کا دفاع کریں گے؟ یہ بات کیسے کہی جاتی ہے کہ مصری قومیت کسی مسلم کے تقاضائے ایمان سے سازگار نہیں ہو سکتی! ہمیں فخر ہے کہ ہم اس وطن عزیز کے مخلص ہیں اس کے لیے ہم تگ و دو کرتے ہیں اور جب تک ہمارے جسموں میں جان رہے گی یہ جسم اس کے لیے وقف رہیں گے کیونکہ جو ترقی ہمیں

مطلوب ہے یہ اس کا پہلا زینہ ہے وطن عربی ایک کل ہے اور اس کل کا یہ ایک جزو ہے لہٰذا بہبود مصر کے لیے جو بھی جدوجہد ہوگی وہ حقیقت میں عربیت، مشرقیت اور اسلام کے لیے ہوگی۔ پھر یہ بات کچھ نقصان دہ نہیں کہ ہم مصر قدیم کی تاریخ، مصری قدماء کے تہذیبی وتمدنی آثار، ان کے علوم وفنون اور تحقیقی کاوشوں کو قدر وتحسین کی نگاہ سے دیکھیں، ہم تو مصر قدیم کا اس حیثیت سے خیر مقدم کرتے ہیں کہ وہ ایک شاندار تہذیب ہے جو مجد وشریف اور علم وفن کے تاروں سے مزین ہے البتہ اس نظریہ کے ہم مخالف ہیں کہ اسے ایک نظام زندگی کی حیثیت سے اپنایا جائے، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے اور مصری تہذیب کو اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جائے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے، جب کہ اللہ نے ہمیں اسلام جیسا کامل نظام عطا کیا، اس کی تعلیمات کے ذریعہ مصر کو صحیح راہ پر لگایا، اس کے لیے اس کے دل میں جگہ پیدا کی پھر اسی کی برکت سے اسے بصیرت کی روشنی ملی اور اسی کے ذریعہ اس کے مجد وشرف میں چار چاند لگے اور یہ تاریخ شرک وبت پرستی کی جن آلودگیوں اور جاہلیت کی جن گندی عادتوں میں ملوث تھی، ان سے اس نے اسلام ہی کے ذریعہ نجات پائی بھلا ایسے کامل ترین نظام کو چھوڑ کر کسی دوسرے نظام کو اپنانے کے لیے کیا درجہ جواز ہو سکتی ہے۔"

یہ روشن اور تابناک کلمات حسن البناؒ کی دعوت وتربیت میں کارفرما اعتدال وتوازن کی ایک نئی جہت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا خصوصی تذکرہ ضروری ہے۔ یعنی وطنیت وقومیت اور اسی نوعیت کے دیگر نظریات کے بارے میں آپ کا موقف کیا تھا!

## وطن وقومی تحریکوں کے سلسلے میں دعوت کا موقف :

اعتدال وتوازن جو حسن البناؒ کے تربیتی نظام میں بنیادی صفت کی حیثیت رکھتا ہے اس کا ایک بہترین مظہر ان دونوں تحریکوں کے بارے میں آپ کا موقف ہے جو ظہور دعوت کے وقت اس علاقہ میں موجود تھیں جیسے وطنیت، قومیت، عربیت، مشرقیت، اور آفاقیت کے نظریات اور

علمبردار تحریکیں اور ان کے سلسلہ میں آپ کا موقف قابل مطالعہ ہے۔

آپ نے ان دعوتوں کو یکسر ٹھکرایا نہ بلا قید و شرط انہیں تسلیم کیا بلکہ اپنی عادت کے مطابق انہیں جانچا، پرکھا، صحیح و غلط میں امتیاز کیا اور اسلامی فکر کے موافق پہلوؤں اور اس کے مخالف گوشوں کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دیا اول الذکر کو اختیار کیا جب کہ آخر الذکر سے کنارہ کش رہے۔

## وطن کی محبت :

اپنے رسالہ "ہماری دعوت" میں وطنیت کے علمبرداروں سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"اگر وطنیت کے ان علمبرداروں کے نزدیک وطنیت کی رح یہ ہے کہ وطن سے محبت ہو، ہر ذرہ وطن سے عشق ہو، طبیعت کو اس سے شیفتگی اور انسیت ہو، اسی کے در و دیوار میں آنکھوں کی ٹھنڈ اور دل کا سکون ہو تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ حب وطن تو ہر انسان کی فطرت میں ہے، اور اسلام نے ان جذبات کو ختم نہیں بلکہ پروان چڑھایا ہے۔ یہ حضرت بلالؓ جو دین و عقیدے کی راہ میں فنا تھے یہی حضرت بلالؓ دار الہجرہ (مدینہ) میں رہتے ہوئے مکہ کی محبت سے بے قرار ہو اٹھتے ہیں اور بے اختیاری میں زبان پر یہ اشعار رواں ہو جاتے تھے جو کس قدر رقت انگیز اور حلاوت سے لبریز ہیں:

أَلَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ أَبِيتَنَّ لَيْلَةً بِوَادٍ وَحَوْلِي إِذْخِرٌ وَجَلِيلُ

"کاش میں جان سکتا، کہ کوئی رات اس وادی میں بھی گزار سکوں گا جہاں میرے اردگرد اذخر اور جلیل ہوں۔"

وَهَلْ أَرِدَنْ يَوْماً مِيَاهَ مَجَنَّةٍ وَهَلْ يَبْدُوَنْ لِي شَامَةٌ وَطَفِيلُ

"اور کیا کسی دن مجنہ کس چشموں پر پہنچ سکوں گا اور کیا شامہ و طفیل بھی مجھے نظر آئیں گے؟"

اسی طرح رسول اللہؐ "اصیل" سے مکہ کی تعریف سنتے ہیں تو شوق و محبت سے آنکھیں

اشکبار ہو جاتی ہیں اور فرماتے ہیں "اصیل اولوں کو قرار ملنے دو۔"

## وطن کی آزادی و سربلندی :

اور اگر وطنیت کی روح یہ ہے کہ وطن کو غاصبوں سے چھڑانے، اسے آزادی دلانے، اور نوجوانان وطن کے دلوں میں آزادی و سربلندی کے جذبات ابھارنے کی جدوجہد کی جائے تو اس تصور سے بھی ہمیں اتفاق ہے، بلکہ اسلام نے تو اس پر بہت زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون ۸)

"حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔"

اسی طرح فرماتا ہے :

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (النساء ۱۴۱)

"اور اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔"

## وطن کی اجتماعی استحکام :

اور اگر وطنیت سے مراد یہ ہے کہ باشندگان ملک کے باہمی تعلقات استوار کئے جائیں، پھر یہ استواری اجتماعی و خیر و بہبود کی راہ میں کام آئے تو اس سے بھی ہمیں اتفاق ہے بلکہ اسلام تو اسے واجبی فرض قرار دیتا ہے نبی کا ارشاد ہے :

وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا

"اور ہو جاؤ اللہ کے بندے بھائی بھائی۔"

اور قرآن کریم یہ تاکید ہے :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا

(آل عمران:۱۱۸)

"اے لوگو! جو ایمان لاؤ ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی کے کسی موقعہ سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔"

## دینی سیادت :

اور اگر وطنیت سے مراد ملک گیری اور زمین پر دین کی سیادت و حکمرانی ہے تو اسلام نے اسے بھی قرار دیا ہوے اور فاتحین کو آبادکاری کی تلقین کی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرۃ:۱۹۳)

"تم ان سے لڑے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جاؤ۔"

## خانہ جنگی اور طوائف الملوکی :

اور اگر وطنیت کی روح یہ ہے کہ امت مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں تقسیم ہو جائے پھر آپس میں جھگڑے ہوں، کینے اور عداوتیں ہوں، دشنام طرازیاں اور تہمت پردازیاں ہوں، چہ میگوئیاں اور سازشیں ہوں اور محض ایسے چند اصولوں کی بنیاد پر خانہ جنگیاں ہوں، جو سراسر خواہشات و نفسیات، ذاتی اغراض و مقاصد اور شخصی مصالح کی دین ہوں، پھر اس صورت حال سے دشمن فائدہ اٹھائیں۔ وہ کینہ و عداوت کے ان شعلوں کو اور بھڑکائیں، وہ باطل کی خاطر تو سب کو ایک کرلیں، مگر حق کی بنیاد پر کبھی یکجا نہ ہونے دیں۔ اور باہمی اتحاد و تعاون کا خواب بھی نہ دیکھنے دیں مگر اپنے میں ملانے اور سب کو اپنے گرد جمع کرنے کی ایک سے ایک تدبیریں کریں یہاں تک کہ اگر وہ جائیں تو ان ہی کے یہاں، اور جمع ہوں تو ان ہی کے مہمان خانوں میں۔ اگر وطنیت کا یہی تصور ہے تو یہ تصور نہایت گھوٹا اور ناکارہ ہے جس سے امت کا کچھ بھلا نہ ہو

گانہ وطنیت کے علمبرداروں کا۔

دیکھا تم نے، وطنیت کے وہ تمام ہی صالح اور صحت مند تصورات جو ملک اور اہل ملک کی خیر وسعادت کے ضامن ہوں، ان کے سلسلے میں نہ صرف ہم وطنیت کے علمبرداروں کے ساتھ ہیں بلکہ ان میں جو انتہا پسند ہیں، ان سے بھی ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔ یاد رہے! وطنیت کے یہ بلند بانگ نعرے اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں بلکہ ان کا ہی ایک جزو ہیں۔

## ہماری وطنیت کے حدود :

البتہ ہمارے نزدیک حدود وطن کا فیصلہ عقیدہ پر ہے، جبکہ ان کے نزدیک ملکی سرحدوں اور جغرافیائی تقسیموں پر ہوگا۔ گویا ہر وہ خطہ زمین جہاں مسلم رہتا اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی اذان دیتا ہو، وہ ہمارا وطن ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کی حرمت کا پاس ولحاظ رکھیں، ہمیشہ اس کے ہمدرد بہی خواہ رہیں اور اس کی ترقی وبہتری کی راہ میں کسی جد وجہد سے دریغ نہ کریں۔ اس طرح ان سارے ہی ملکوں کے مسلمان ہمارے بھائی ہوں گے۔ چنانچہ ہم ان کے لیے فکر مند ہوں گے اور ان کے جذبات واحساسات میں برابر کے شریک ہوں گے، مگر جو محض وطنیت کے علمبردار ہیں، ان کا حال اس سے مختلف ہوگا۔ ان کی توجہات کا مرکز تو بس وہی چھوٹا سا محدود علاقہ ہوگا جسکے گرد وپیش سے انہیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ عملاً یہ فرق اس وقت نمایاں ہوگا جب کوئی مسلم قوم دوسری مسلم حکومتوں کے مقابلہ میں اپنے ہاتھ مضبوط کرنا چاہے کیونکہ کسی بھی اسلامی ملک کے مقابلے میں ہم اس طرح کہ سرگرمیاں گوارا نہ کرسکیں گے ہماری تو یہ کوشش ہوگی کہ ہم سبھی کے ہاتھ مضبوط ہوں مزید خالص وطنیت کے علمبردار اسی میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھیں گے بس یہیں سے تعلقات میں رخنے پڑیں گے، قوتیں کمزور ہوں گی اور دشمن بیچ میں آگھسیں گے۔

## ہماری وطنیت کی غایت :

ایک تو یہی ہے، دوسرے جو خالص وطنیت کے علمبردار ہوں گے ان کے آخری آرزو یہ

ہوگی کہ اپنے ملک کو آزاد کرالیں پھر وہ اس کی مادی ترقی اور مادی استحکام کے لیے کوشاں ہوں گے جیسا کہ آج یورپ کر رہا ہے مگر ہمارا تو عقیدہ ہے کہ مسلم کی گردن پر ایک بڑی ذمہ داری ہے جو اسے ادا کرنی ہے جس کی اہمیت متقاضی ہے کہ اس کی راہ میں نہ جان کی پرواہ کی جائے نہ مال کی۔ وہ ذمہ داری کیا ہے؟ سینوں کو نور اسلام سے منور کرنا، زمین کے چپہ چپہ پر حق کا پرچم لہرانا۔ پھر طبیعت کا اس طرح بے لوث ہونا کہ اس کے پیچھے نہ کسی مال وجاہ کی تمنا ہو نا غلبہ واقتدار کی ہوس اور نہ کسی قوم کو محکوم بنانے کی خواہش ہو۔ بلکہ اس کا محرک ہو رب کی رضا جوئی، حق کی سربلندی، دین کی ضیا پاشی اور انسانیت کی بہی خواہی یہی وہ چیز ہے جس کے ہاتھوں سلف صالحین نے وہ مقدس فتوحات انجام دیں کہ دنیا کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور تاریخ انسانی نے اب تک عدل و انصاف، شرافت و پاکیزگی اور بلندی اخلاق کے جو نمونے دیکھے تھے وہ سب ہیچ نظر آنے لگے۔

## دعوت کے سلسلے میں لوگوں کا موقف :

حسن البنا شہید دعوت کے سلسلے میں افراد کے رویہ اور طرز عمل کی وضاحت کرتے ہیں اور انہیں چار قسم کے رویوں میں سے کوئی ایک رویہ اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

۱۔ "اہل ایمان : اگر کوئی شخص ہماری دعوت کو سمجھ چکا ہے ہماری باتوں سے اتفاق رکھتا ہے، ہمارے اصولوں سے وہ متاثر ہے اور ان ہی کو خیر و بہتری کی کلید سمجھتا ہے، نیز دل کو یقین کی ٹھنڈ حاصل ہے اور ذہن لذت اطمینان سے بہرہ مند ہے، تو ایسے شخص کو ہم دعوت دیں گے کہ وہ جلد سے جلد آ کر ہم میں شامل ہو جائے۔ ہمارے ساتھ مل کر کام کرے کہ اس طرح مجاہدین کی تعداد میں اضافہ ہو اور اہل دعوت کی آواز پر اثر ہو، ورنہ ایسے ایمان کے کیا معنی جو ولولہ شوق اور جوش عمل سے بے تاب نہ کر دے؟ مومنین اولین جن کے سینے اللہ نے ہدایت کے لیے کول دیئے تھے، ان کا یہی حال تھا۔ انہوں نے انبیاء کی پیروی کی، ان کے پیغامات پر ایمان لائے اور راہ خدا میں جی جان سے قربان ہو گئے۔ بلاشبہ وہ خدا کے ہاں اجر عظیم سے ہمکنار ہوں گے، اور بعد میں جتنے

لوگ بھی ان کی راہ میں آئیں گے، ان سب کے ثواب میں شریک ہوں گے، تاہم خود ان کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

۲۔ تردد کے شکار :اور اگر کوئی تردد کا شکار ہے، حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور ہماری باتوں میں اسے اخلاص کی بو یا افادیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تو اسے ہم وابستہ تحریک ہونے کی دعوت نہیں دیں گے، تاہم اسے دعوت دیں گے کہ وہ قریب سے ہمیں دیکھے اور دور و نزدیک سے ہمیں سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ ہماری کتابوں کا مطالعہ کرے۔ ہماری مجلسوں میں شریک ہو اور ہمارے بھائیوں سے ربط رکھے۔ انشاء اللہ وہ جلد ہی مطمئن ہو جائے گا۔ انبیاء کرام کے پیروؤں میں جو لوگ تردد کا شکار ہوتے ان کی یہی صورت ہوتی تھی۔

۳۔ منفعت کے غلام :اور اگر کسی نے یہ طے کر لیا کہ وہ اس وقت تک ہمارا ساتھ نہیں دے گا جب تک اسے کسی منفعت کی توقع یا مال غنیمت کی امید نہ ہو تو اس سے ہم کہیں گے : کچھ دردمندی سے کام لو، ہمارے پاس تو کچھ نہیں ہے البتہ اگر اخلاص سے کام لو گے اور نیک نیتی کو رہ دو گے تو اللہ تمہیں بہت دے گا، وہ اپنی جنت سے نوازے گا اور نعمتوں سے نہال کر دے گا۔ ورنہ ہم تو گمنام و نادار لوگ ہیں۔ ہمارے پاس ہے ہی کیا؟ جاہ و منزلت ہے نہ مال و دولت، بس جو کچھ مل جائے اسے ہم اس سے رہ میں لٹا تیں اور رضائے الٰہی کی امید رکھتے ہیں، وہی ہمارا بہترین سرپرست اور بہترین مددگار ہے۔ اب اگر اس کی آنکھیں کھل گئیں اور طمع کا یہ روگ دور ہو گیا تو وہ محسوس کرے گا کہ اللہ کے یہاں جو کچھ ہے وہی بہتر اور لازوال ہے اور پھر وہ راہ خدا میں خرچ کرنے اور ثواب الٰہی سے سرفراز ہونے کے لیے خدائی فوج میں آملے گا۔ بلاشبہ اس دنیا کی نعمت چند روزہ ہے اور آخرت کی نعمت لازوال اور بے پایاں ہے۔ لیکن اگر اس کی آنکھیں نہیں کھلیں اور حرص و آز کی آگ اسی طرح دہکتی رہی تو خدا بھی اس سے بے نیاز ہے۔ ظاہر ہے اسے ایسوں کی کیا ضرورت ہے جو ان و مال دنیا و آخرت اور موت و زندگی میں

سب سے پہلا حق اس کا نہیں سمجھتے غالباً اسی طرح کے لوگ تھے جنہوں نے دست رسالت پر بھی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اسی شرط پر راضی تھے کہ آپؐ کے بعد اقتدار کے وارث ہوں۔ اس موقع پر نبیؐ نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا "زمین اللہ کی ہے، وہ جسے چاہے گا اس کا وارث بنائے گا۔ اور کامیابی متقین ہی کے لیے ہے۔"

۴۔ جنگجو طبیعتیں :اور اگر کوئی ہم سے بدگمان ہے۔ وہ ہم سے متنفر اور بیزار ہے وہ ہمیشہ سیاہ عینک سے دیکھتا ہے اور جب بھی زبان کھولتا ہے تو فتنہ انگیزی کی باتیں کرتا ہے، وہ اپنے فریب خوردہ ہی رہنے پر نازاں ہے اور شکوک سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہے، تو ہم اللہ سے دعا کریں گے کہ ہمیں حق کو حق سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق دے، اور باطل کو باطل سمجھنے اور اس سے دور رہنے شعور عطا کرے اور ہم دونوں کے دلوں میں پاکیزہ جذبات اور اچھے خیالات کا الہام کرے نیز ہم اسے بھی پکاریں گے اگر وہ پکار کو سنے اور اسے بھی آواز دیں گے اور وہ آواز پر کان دھرے۔

ہماری محبتیں برابر اس کے ساتھ ہوں گی اور ہم کبھی اس سے مایوس نہ ہوں گے اس کے سلسلے میں تو ہمارا وہی انداز ہوگا جو اس سے پہلے محسن عالم کا رہا ہے کہ آپؐ اپنی قوم کے لیے دعا فرماتے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

"اے اللہ میری قوم کو بخش دے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں۔"

اس درجہ فراخ و پاکیزہ روح اور اتنے عظیم و وسیع قلب کے ساتھ، اس حکیمانہ اسلوب کے ذریعہ اپنے معاشرے کو دیکھتے اور اپنی دعوت بارے میں اس کے موقف کو متعین کرتے تھے اسی طرح غایت درجہ حکمت و اعتدال کے ساتھ ان کے سلسلے میں اپنا موقف اختیار کرتے تھے اور آپ کا یہ موقف نہایت نمایاں رہا ہے اسے ہم "اعتدال و توازن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

فصل (۵)

# اخوت واجتماعیت

رحماء بینھم

واحد قومیت

اخوت۔ خدا کی عظیم نعمت

محبت سلاخوں کے پیچھے

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

(اقبالؒ)

## رحماء بینھم:

وہ بنیادی صفات، جن کی بنیاد پر اخوان کی تعمیر و تربیت ہوئی، ان میں سے ایک اہم صفت اللہ کے لیے محبت اور بھائی چارگی ہے خود اس تحریک کا نام اسی مفہوم پر مشتمل ہے یعنی الاخوان المسلمون (مسلم بھائی) امام البنا نے اخوت اور بھائی چارہ کو بیعت کا ایک اہم رکن قرار دیا اس کی تشریح وہ یوں کرتے ہیں۔

''بھائی چارہ سے مراد یہ ہے کہ ہم محض رشتہ و عقیدہ کی بنیاد پر باہم ایک جان دو قالب ہو جائیں۔ کیونکہ عقیدہ ہی سب سے زیادہ قوی اور قیمتی رشتہ ہے اور اخوت ایمان کا لازمہ اور افتراق و عداوت کفر کا خاصہ ہے۔ علاوہ ازیں سب سے اولین قوت وحدت کی قوت ہے اور محبت کے بغیر وحدت کہاں؟ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ محبت کا سب سے کمتر درجہ ہے دل کا گرد کدورت سے پاک ہونا جب کہ اس کا سب سے بلند درجہ ہے ایثار کرنا، اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینا۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (التغابن ۱۶)

''جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

ہمارے ہر مخلص بھائی کو سمجھنا چاہیے کہ اس کے اوپر دوسرے بھائیوں کا خود اس کی اپنی ذات سے زیادہ حق ہے، کیونکہ اگر وہ ان کا نہ ہو سکا تو کسی اور کا کیا ہوگا اسی طرح اور بھائی اگر اس کے اپنے ہو گئے تو پھر دوسروں کے بھی ہو سکیں گے۔ بھیڑیا ہمیشہ اسی بکری کو کھاتا ہے جو گلہ سے دور ہو۔ یہی حال مومنین کا ہے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عمارت ہو کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط رکھتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (توبہ: ۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔''

ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اسی طرح رہیں اور اپنے عمل سے بالکل اسی انداز کا نمونہ پیش کریں۔"

میں نے امام شہید کو ایک بار کہتے سنا "ہماری دعوت تین بنیادوں پر قائم ہے گہرے فہم، مضبوط ایمان، اور پائیدار محبت پر۔"

امام تحریک کے مرکز میں اپنی ہفتہ وار گفتگو "مجلس سہ شنبہ" میں تقریر کا آغاز ترغیبی کلمات سے کرتے تاکہ تحریک کے کارکنان محبت و اخوت کے بندھن میں بندھ جائیں اور یک جان و دو قالب ہو جائیں۔ مرحوم اسی سلسلہ میں تصوف اور سلف کے واقعات سے بھی مدد لیتے جسے وہ "محبت سہ شنبہ" کا نام دیتے۔

دور و نزدیک کا ہر فرد جانتا تھا کہ اخوان کارکنان میں کس قدر باہمی محبت اور مضبوط رشتہ ہے اور وہ حدیث نبوی کی منشاء کے کس قدر مشابہ ہیں۔

مومن مومن کے لیے عمارت کی حیثیت رکھتا جس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت پہنچاتا ہے یہ کارکنان باہمی الفت، بھائی چارہ اور اخوت میں ایک ہی خاندان کے متعدد افراد سے کس قدر مشابہ ہیں! بلکہ ان سب کی حیثیت ایک جسم کیسی ہے جس کے کسی عضو میں تکلیف ہو جائے تو پورا بدن اس کا کرب محسوس کرتا ہے۔

کسی صحافی نے اخوان کے آپس کے تعلقات کو دیکھا تو پکار اٹھا:

"وہ جماعت ہے جس کے کسی کارکن کو اسکندریہ میں چھینک آئے تو اسوان سے یرحمک اللہ کی دعائیں سنی جاتی ہیں۔"

## واحد قومیت:

اخوان نے قومیت، وطنیت، لسانیت یا طبقہ واریت کے سارے بتوں کو پاش پاش کر دیا، انہوں نے انسانی تعلقات کے درمیان حائل تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیا انسانوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے والے تمام امتیازات مٹا ڈالے صرف اسلام کی اخوت باقی رہی، اسلام کا

رشتہ بچ رہا جو دوسرے تمام رشتوں پر چھا گیا۔

اَبِی الْاِسْلَامُ لَا اَبَ لِی سِوَاهُ اِذَا افْتَخَرُوا بِقَیْسٍ اَوْ تَمِیْمِ

''میرا باپ اسلام ہے اس کے سوا میرا کوئی باپ نہیں حالانکہ لوگ قیس اور تمیم کے رشتے پر فخر کرتے ہیں۔''

اخوان کے دور میں انجینئر و مزدور، معالج و مریض، مدرس و کسان، شہری و دیہاتی، بزرگ و جواں خورد و کلاں غرضیکہ معاشرے کے سارے طبقے اور ہر عمر کے لوگ شانہ بشانہ کام کرتے نظر آتے ہیں جن کے درمیان صرف دینی محبت و اخوت کا رشتہ تھا جو اس سے پہلے اصحاب رسول میں جنس و نسل اور طبقہ و قوم کے اختلاف کے باوجود پایا جاتا تھا۔ سچ کہا ہے اللہ نے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔''

قاہرہ میں اخوان کا عوامی مرکز ایک عالمی گھرانہ تھا جس میں جنس و وطن کے سارے بھید بھاؤ ختم ہو جاتے تھے صرف ایک رشتہ کی وہاں گنجائش تھی جو سب سے پائیدار اور مضبوط رشتہ ہے اور وہ رشتہ ہے تقویٰ کا، اسلام کا، خدا پرستی اور خدا ترسی کا۔

اس مرکز میں عربی بھی آتے تھے اور عجمی بھی، افریقی بھی ایشیائی بھی، شامی بھی اور مغربی بھی۔ کالے بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے گورے بھی، سرخ بھی زرد بھی، یہ سب مختلف ملکوں سے آتے تھے۔ مختلف جنس و نسل کے مالک تھے، متنوع زبانوں کے حامل تھے بلکہ بسا اوقات ان کے ممالک آپس میں باہم دست و گریباں تھے لیکن یہاں اس ''گھرانہ'' میں اتحاد اسلامی کے رمز و نشاں، ''دارالاخوان'' میں سب بھائی بھائی بن جاتے تھے اور یہ اخوت تاحیات قائم رہتی تھی۔

ان میں بہت سے مصری اخوانی بھائیوں میں مدغم ہو کر ان کا ایک فرد بن گئے تھے گرچہ

جنسیت کے لحاظ سے وہ افغانی، عراقی یا ہندوستانی یا کسی اور ملک سے تعلق رکھنے والے تھے۔

ان فاضل بھائیوں میں عبداللہ عقیل، ہارون المجددی، اور مصطفی اعظمی کا نام مجھے ابھی تک یاد ہے۔ موخر الذکر دونوں بھائی ۱۹۵۴ء میں اپنے مصری بھائیوں کے ساتھ جنگی قید خانے میں بھی گئے اور وہاں کی سزاؤں اور تکلیفوں کا مزہ چکھا اور ناصری ظلم وطغیان کے سامنے ان کی جنسیت کا اختلاف بھی انہیں خاموش تماشائی کی حیثیت سے رہنے پر مطمئن نہ کر سکا۔

عظیم داعی اسلام ڈاکٹر مصطفی السباعیؒ نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا کہ "اپنی زندگی کے آخری برسوں میں جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو اس کا علاج کے لیے مجھے یورپ جانا ہوا۔ میں ہوائی جہاز سے جس شہر میں بھی اترا تو وہاں مختلف الاجناس نوجوانوں کو اپنے انتظار میں پاتا۔ وہ میری ضروریات اور پسند کی تمام چیزیں اور انتظامات مہیا رکھتے۔ وہ یہ واقعہ بیان کر رہے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی کہہ رہے تھے۔" بخدا میں ان میں سے کسی کو پہچانتا نہ تھا، کسی سے میری ملاقات بھی نہیں تھی لیکن عقیدہ کی اخوت اور دعوت کا رشتہ جس کی برکتوں سے اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی محروم نہ کرے۔ ایسا مضبوط تھا جس نے مجھے یہ احساس کرنے پر مجبور کر دیا کہ گویا میں برسوں سے ان کا دوست رہا ہوں اور وہ میرے پرانے شناسا رہے ہیں۔

## اخوت خدا کی عظیم نعمت :

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے لیے دوستی اور محبت کی نعمت اس کے دین کا رشتہ ان تمام احسانات سے بڑھ کر ہے جو خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کئے ہیں اور یہ تعلقات ایمان کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں۔ مدینہ میں مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے :

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران:۱۰۳)

"اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل وکرم سے تم

بھائی بھائی بن گئے۔"

اور اپنے رسولؐ پر احسان جتاتے ہوئے کہتا ہے :

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (الانفال: ۶۳،۶۲)

"وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے۔ مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔"

دنیا نے ایسے افراد اور جماعتوں کو دیکھا جو آپس میں تعلق اور الفت کا مظاہر کرتے تھے لیکن ان کا یہ محبت دنیا طلبی کے لیے تھی۔ اس لیے اسے دوام حاصل نہ ہو سکا۔ یہ افراد کسی محسوس شہوت یا مادی منفعت کے گرد جمع ہوئے تھے جب انہوں نے شہوت کی تکمیل کر لی یا فائدہ حاصل کر لیا یا اس سے یکسر مایوس ہو گئے تو ان کی جمعیت منتشر ہو گئی اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا بلکہ بسا اوقات ان کی نام نہاد محبت خصومت و عداوت میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن جو محبت اللہ کے لیے ہوتی ہے اور اس کی رضا کی راہ میں ہوتی ہے وہ اس وقت باقی رہتی ہے جب تک اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی یعنی ابدالآباد تک، اسی لیے مشہور جملہ ہے، "جو محبت اللہ کے لیے ہو گی اسے دوام و استحکام ملے گا اور جو غیر اللہ کے لیے ہو گی وہ ختم ہو جائے گی۔ ٹوٹ جائے گی۔"

## محبت سلاخوں کے پیچھے :

یہ مخلصانہ محبت اور سچی اخوت آزمائش کی گھڑیوں اور سختی و تنگی کے حالات میں اور زیادہ پائیدار اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں تعلقات کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور محض

دوستوں اور چاپلوس مکاروں کے درمیان فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔شاعر کا یہ شعر کتنا صحیح ہے :

جَزَى اللهُ الشَّدَائِدَ كُلَّ خَيْرٍ
عُرِفْتُ بِهَا عَدُوِّي مِنْ صَدِيقِي

"اللہ تعالیٰ ان سختیوں کا بھلا کرے جن کے ذریعہ میں نے اپنے دشمنوں اور دوستوں کو پہچان لیا۔"

حضرت علیؓ کے یہ اشعار کتنے مبنی بر حقیقت ہے :

وَلَا خَيْرَ فِي وِدِّامْرِئٍ متلون
إِذَ الرِّيحُ مَالَتَ مَالَ حَيثُ تَمِيلُ

"ایسے بے رنگ شخص کی دوستی میں کوئی بھلائی نہیں جو ہوا کے رخ پر بہہ جاتا ہے۔"

جَوَاد إِذَااسْتَغْنِيتَ عَنْ أخذ مَاله
وَعِندَاحتِمَالِ الفقْر عَنكَ بَخِيلُ

"جب تمھیں اس کے مال کی ضرورت نہیں رہتی تو بڑا سخی بنتا ہے اور جب تمہارا مال ختم ہوجاتا ہے تو کنجوسی دکھاتا ہے۔"

وَمَا أكثَرَ الإخوَانَ حِينَ تعدُّهم
ولَكِنَّهُم فِي النَّائِبَاتِ قَلِيلُ

"اگر مہمان نوازی ہو تو دوستوں کی کثرت رہتی ہے لیکن مصیبتوں میں وہ تمہاری پاس سے چھٹ جاتے ہیں۔"

اخوان پر کمر توڑ آزمائشیں آئیں تو ان کی دوستی اور محبت نے بڑے عجیب وغریب کرشمے دکھائے کتنے ہی افراد ایسے تھے جن کے گوشتوں سے کوڑے شکم سیر ہوئے ان کے گرم گرم خون نے انھیں سیراب کر دیا۔لیکن وہ خاموش رہے اپنے کسی بھائی سے کوئی فریاد نہ کی۔ بسا اوقات ان کی خاموشی اتنی طول طویل ہوئی کہ جیل کی کال کوٹھریوں میں ان کی روحیں چل بسیں اس حال

میں کہ ان کے دل مطمئن تھے لیکن اپنے بھائیوں سے کوتاہیات نہ کی مبادا انہیں بھی اس پاداش میں تکلیف پہنچائی جائے۔

کتنے ہی نوجوانوں نے اپنی طاقت و استطاعت سے بڑھ کر جیلوں کے عذاب برداشت کئے۔ صرف اس لیے کہ جو بھائی کثیر العیال ہیں یا برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے انہیں اس ہولناک عذاب سے نجات ملی رہے :

بہتیرے ایسے نوجوان تھے جو جیلوں سے باہر امداد رسی کا کام کرتے تھے جنہیں کوئی نہ جانتا تھا لیکن اخوانیوں کی دار و گیر کے بعد ان کے بے سہارا بچے ان سے دیکھے نہ گئے ان کی محبت و حمیت نے جوش مارا اور انہوں نے تعاون اور چندے جمع کرنے کے لیے ایک انجمن بنائی تا کہ یہ گھرانے جن کے شوہر و سرپرست چھین لیے گئے ہیں، مالداری و بے نیازی کے بعد انہیں محتاج و بے آسرا بنا دیا گیا ہے، عزت و ناموری کے بعد انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی مالی امداد کی جا سکی اور اس کار خیر کے نتیجہ میں وہ اقتدار کی نظروں میں چڑھ گئے ان کی گرفتاریاں عمل میں آئیں انہیں تعذیب و تشدد کا نشانہ بنایا گیا پھر عدالت سے ان کے خلاف فیصلہ ہو گیا تاحیات جیلوں میں انہیں دھکیل دیا گیا اور محنت و مشقت کے کام لیے گئے۔

لیکن ان لوگوں کی گرفتاری بعد والوں کے لیے رکاوٹ نہ ثابت ہو سکی کیونکہ اخوان کے یہاں اس بات کی گنجائش بہر حال نہیں تھی کہ اپنے بھائی کی کسی آزمائش کے وقت کوئی بھائی اس کے بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے اور ان کی خبر گیری نہ کرے۔ چنانچہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

جیل کوٹھڑیوں نے باہمی تعاون اور ایثار کے وہ کارنامے دیکھے جن کے لکھنے میں صفحات کی تنگی دامانی مانع ہے۔ کھانے اور کپڑے کسی قیدی بھائی کے حصے کے آتے تھے تو انہیں اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں تقسیم کر دیتا تھا اور وہ خود دوسروں کے بقدر ہی لیتا تھا اور کبھی کبھی تو وہ بھی دوسروں کے حوالہ کر دیتا۔

اس اخوت کی نعمت اور جذبہ کی قیمت وہی لوگ جان سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ جیلوں کی زندگی کیا ہے اور وہاں دوسرے قیدی کس طرح اپنے شب و روز گزارتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۹ء میں جب "ہا یکستب" کے قید خانے میں تھا، تو ہمارے پڑوس میں کیمونسٹوں کا ایک گروپ بھی رہتا تھا وہ آپس میں معمولی معمولی باتوں پر لڑ بیٹھتے تھے ان میں سے ہر ایک اپنی ذات کا غلام اور اپنی منفعت کا پجاری تھا۔ کھانے پینے کا جو سامان آتا وہ اس کا اپنا ہوتا۔ جس کمرے میں وہ رہتے تھے اسے سینٹی میٹر سے ناپ کر بانٹ لیا تھا اور ہر ایک بس اپنے حصے کی زمین پر جھاڑو لگاتا تھا اس میں کمی کرتا نہ اضافہ، اس کے باوجود وہ ہمیشہ دھینگا مشتی کرتے اور باہم برسر پیکار نظر آتے۔

# خاتمہ

محترم قارئین! میں یہ نہیں کہتا کہ اخوان فرشتے ہیں ہر غلطی سے مبرا ہیں یا انبیاء ہیں جن سے خطا سرزد ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ نہیں اخوان بھی دوسرے انسانوں کیطرح عام انسان ہیں جن سے خطائیں بھی سرزد ہوتی ہیں اور نیکیاں بھی وہ ٹھوکر بھی کھاتے ہیں اور سنبھل بھی جاتے ہیں وہ اس امت کے ایک عام فرد کی طرح جنہیں اللہ کی کتاب وراثت میں ملی ہے :

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ (فاطر:۳۲)

"ان میں سے کوئی تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راس ہے اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔"

ہوسکتا ہے کہ آپ کو ایسے اخوان بھی مل جائیں جو صرف اسلام کا نام جانتے ہوں اور قرآن پاک کی تلاوت پر بس کرتے ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مراحل میں اور خاص طور پر پانچویں دہائی کے آغاز میں دعوت کی طرف آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ان کی وہ تربیت نہ ہوسکی جو انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیتی اور اسی طرح وہ اسلامی گھرانے کے رشتے میں منسلک ہو جاتے لیکن جماعت انہیں ٹھکرا بھی نہیں سکتی تھی گرچہ ان کا برتاؤ ایک مسلم کے شایاں نہ تھا اس لیے کہ اس تحریک کا مرکز ایک "ہسپتال" کی مانند تھا جو مریضوں کے علاج کے لیے قائم کیا جاتا ہے یا اس کی حیثیت "ورکشاپ" کی سی تھی جس میں خستہ وشکستہ ساری گاڑیاں آتی ہیں تاکہ ان کی مرمت ہوسکے اور انہیں استعمال کے قابل بنایا جاسکے۔

یہ بات بھی اوجھل نہ ہونی چاہیے کہ تحریکیں عروج وترقی کے دور میں ہوتی ہیں ان میں منفعت کے بندے اور حسد کرنے والے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں جن کا مقصد دنیا طلبی کے سوا

کچھ اور نہیں ہوتا۔ یہ اپنی زبان سے تو اس کی صداقت کا اقرار کر لیتے ہیں لیکن دل ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ ایسے افراد سے دعوت کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی، کوئی معاشرہ ایسے عناصر سے خالی نہیں رہا ہے یہاں تک کہ دور نبوت کا مدنی معاشرہ بھی ان کے وجود سے پاک نہ تھا۔

اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اخوان کے کل عیوب سے پاک تھے، صد فی صد غلطیوں سے مبرا تھے تو وہ اخوان سے ناواقف ہے، واقعات وحقائق سے ناواقف ہے اور تاریخ سے ناواقف ہے۔ واقعات وحقائق سے ناواقف ہے اور تاریخ سے ناواقف ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اخوان المسلمون بحیثیت مجموعی اس امت کے پاکیزہ نفوس پر مشتمل تھی جن کی عقلیں ہر غلامی سے آزاد تھیں، دل پاکیزہ تھے، نفوس پاک و صاف تھے ان کا اخلاق مثالی تھا، برتاؤ اور سلوک میں نظافت تھی، وہ اللہ کے دین کے لیے شجاع وبیباک اور بہبودی عوام سے محبت رکھنے والے تھے، اسلام کے لیے ان کی اندر غیرت وحمیت تھی اس کے مجد وشرف کی بحالی کے لیے سراپا حرکت وعمل تھے، شریعت کی حکمرانی اور امت مسلمہ کی قیادت کے لیے ہمہ تن گ و دتاز تھے۔

اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہیں گے کہ وہ وسائل اور طریق کار جو پچھلے سالوں میں تربیت وتعمیر کے لیے اپنائے گئے، انہوں نے اپنے نتائج ظاہر کئے اور چند سالوں تک اپنے ثمرات دکھاتے رہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ طویل تجربوں اور حالات کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کریں۔

ابھی اس دعوت کو صرف نصف صدی گزری ہے لیکن حالات بالکل بدل چکے ہیں، نئے نئے افکار سامنے آچکے ہیں، قدریں بدل گئی ہیں، ہمارے اپنے علاقے میں بھی اور پوری دنیا میں بھی۔

دانش مندی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اس وسیع وہمہ گیر انقلاب کی حامل دنیا کے بیچ میں ہر پرانی چیز کو اس کی پرانی روش اور طریقے پر باقی رکھا جائے۔ اسلام اہداف ومقاصد میں ثابت قدمی کا مطالبہ کرتا ہے تو دوسری طرف وسائل وذرائع میں تبدیلی اور لچک سے بھی واقف ہے۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

اخوان المسلمون 1929ء میں مصر میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی شیخ حسن البنا تھے جو اسمٰعیلیہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اس تحریک کا آغاز 1923ء میں کیا تھا مگر 1929ء میں اسے باقاعدہ شکل دی گئی۔ اس کا مقصد اسلام کے بنیادی عقائد کا احیا اور ان کا نفاذ تھا۔ مگر بعد میں یہ جماعت سیاسی شکل اختیار کر گئی۔ مصر میں یہ تحریک کافی مقبول ہوئی اور اس کی شاخیں دوسرے عرب ممالک میں بھی قائم ہو گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر اس کے اراکین کی تعداد بیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

1952ء میں جب اخوان المسلمین کی طرف سے جنرل نجیب اور جنرل ناصر کی خاصی پالیسی کی بھی مخالفت کی گئی تو 1954ء میں مصری وزیر داخلہ جمال عبدالناصر نے الزام لگایا کہ اس کے اراکین نے جنرل ناصر کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کی جس کے بعد یہ جماعت خلاف قانون قرار دے دی گئی اور اس کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ البتہ یہ الزام کبھی ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اس جماعت کے رہنما شیخ حسن الہضیبی نے اپنا صدر مقام قاہرہ سے دمشق تبدیل کر لیا۔ اس جماعت نے عرب قوم پرستی کے خلاف شدید آواز اٹھائی اور اسلامی بھائی چارے کا نعرہ لگایا۔ جس کی پاداش میں جماعت کے بہت سے اراکین کو جیلوں میں بند کر دیا گیا اور سید قطب شہید جیسے لوگوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ پابندی کے بعد بھی یہ جماعت باقی رہی اور پورے عرب علاقوں میں پھیل گئی۔ اخوان کا پاکستان کی جماعت اسلامی سے قریبی تعلقات ہیں۔

ORDER BOOKS ONLINE
www.imtbooks.com